فلسفہ قرآن مجید

مصنف
حضرت پیر صاحب دیول شریف

بسم اللہ تعالیٰ

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ

پڑھ! اپنے (اُس) رب کا نام لے کر جس نے پیدا کیا

فلسفۂ قرآن مجید

در

شانِ نزولِ فرقانِ حمید

قرآنِ عظیم کے چودہ سو سالہ جشنِ نزول کے موقع پر مملکتِ خداداد پاکستان کے روحانی پیشوا

صدر مرکزی جمعیت المشائخ پاکستان

حضرت خواجہ محمد عبد المجید احمد قادری (پیر صاحب دیول شریف) مدظلہ العالی

کی پیش کردہ

جامع، مبسوط اور پُر حقیقت تصنیف

ناشر: پیر روح الحسنین معین خلف الرشید پیر صاحب دیول شریف،

آستانہ عالیہ قادریہ وادی دیول شریف مورگاہ راولپنڈی

بِاسْمِہٖ سُبْحَانَہٗ

میں اپنی اِس تالیف و ترتیب کو

علما و مفکرینِ قوم کے نام معنون کرتا ہوں

محمد عبد الصمد الحمد

راولپنڈی } یکم رمضان ۱۴۱۲ھ
۲۴ فروری ۱۹۹۲ء

گر تو مے خواہی مسلماں زیستن

نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

حکیم الامت علامہ اقبالؒ

نام کتاب :- فلسفۂ قرآن مجید

مصنّف :- اعلیٰ حضرت پیر خواجہ محمد عبد المجید احمد قادری مدظلہ العالیٰ

ناشر :- پیر روح الحسنین معین

طبع اوّل :- نومبر ۱۹۶۸ء ایک ہزار

طبع دوم :- فروری ۱۹۹۳ء ڈیڑھ ہزار

کتابت :- محمد اقبال ہاشمی

قیمت :- ۱۰۰/- روپے غیر مجلد
۱۵۰/- روپے مجلد

مقام اشاعت :- آستانہ عالیہ قادریہ ۔ دیول شریف
وادیٔ دیول شریف (مورگاہ) راولپنڈی

پرنٹر :- معاذ پرنٹنگ پریس بلاک نمبر ۴
جوہر آباد فون : ۳۰۹۵
ضلع خوشاب ۔ کوڈ : ۰۴۵۴

ترتیب

حمد باری تعالیٰ

میری روحِ زندگانی تیرا نام ہے خدایا
تیرے نام ہی سے اب تو میرا کام ہے خدایا

تیری یاد زندگی ہے تیرا ذکر بندگی ہے
تیری حمد میرے لب پر تو مدام ہے خدایا

تیرے عشق ہی میں جینا تیرے عشق ہی میں مرنا
یہی کیفِ غیر فانی یہی جام ہے خدایا

یہی ہے نجاتِ انساں یہی روحِ شرحِ قرآں
تیرا ذکرِ جاودانی وہ کلام ہے خدایا

تیری صبح بھی ثنا خواں تیری شام بھی ثنا خواں
جو پڑھا نبیؐ پر تو نے وہ سلام ہے خدایا

جو نصیب مصطفےٰؐ کی ہو معینؔ رہنمائی
تیری بارگاہِ عالی تو دو گام ہے خدایا

پیر روح الحسنین معینؔ

ایک وجد انگیز
نعتِ مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم

۲۳، رمضان کی سحری کو عالمِ وجد میں مجھ سے یہ نعت سرزد ہوئی۔ جس کو واردات عرشیانہ سے تعبیر کیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔

اِس وجدانگیز نعت کے بعد مَیں سو گیا تو مجھے اس نعت کا صحیح مرتبہ بتایا گیا۔ مَیں یہ دیکھتا ہوں کہ دنیا کے وسیع ترین میدان میں سارے اولیاء اللہ صف باندھے روبقبلہ بیٹھے ہیں اور ایک ابدال کو حکم ہوتا ہے کہ فقیر دیول شریف کی وجدانگیز نعت سُناتے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے اس ابدال کا نام نامی اسمِ گرامی سیّد محمّد یوسف رح تھا۔ اُنھوں نے اس نعت کو جھُوم جھُوم کر وجدانگیز صورت میں پڑھا۔ اُس وقت ایسا سماع بپا ہوگیا کہ ہر طرف اولیاء اللہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے۔ نتیجتاً سب اولیاء اللہ کی رائے سے یہ فیصلہ دیا گیا کہ جو کوئی اس نعت کو رات دن پڑھے گا اس کو حضرت محمد مصطفٰے علیہ السلام کا دیدارِ پُرانوار نصیب ہوگا۔

پیر صاحب دیول شریف

نعتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

میں گیت محبت کے گا کر پھر اپنے پیا کو مناتا ہوں
وہ مکھڑا چاند کو شرماتے میں اپنی بپتا سناتا ہوں

جنگل کے چکوروں کو دیکھوں کوئل کی اداؤں پہ لپکوں
یادوں کو کملی والے کی پھر تازہ یاد دلاتا ہوں

وہ آئے عرشِ علیٰ سے مکین وہ نورِ الٰہ کی نور جبین
میں ان سے ملوں وہ مجھ سے ملیں پر نور چراغ جلاتا ہوں

آنکھیں ہیں سمندر کی ٹھاٹھیں مژگاں ہیں تیر کمانوں میں
ابصار ہیں خیرہ دل بسمل دیدار کو پھر بھی پاتا ہوں

نے تابِ سخن نے تابِ نظر نے جھانک سکوں اور جھات کروں
پروانہ ہوں جو اپنے پر اس آگ میں روز جلاتا ہوں

یہ حسنِ ازل ہے بانگِ ازل یہ نورِ ازل ہے جانِ ازل
بلبل کی غزل در صحنِ چمن بن بن کر دل بہلاتا ہوں

اک ہو کے عالم میں ہلچل آتی ہے تبسم آجائے
میں راہیں بھول بھلا کر بھی محبوب کی راہ پا لیتا ہوں

خورشید و قمر ہیں شرمندہ اور تارے فلک کے ماند ہیں سب
میں دشتِ غریباں میں بیٹھا محبوب کی نعت سناتا ہوں

آنکھوں کی چمک چہرے کی جھلک انوار کو قدس میں لاتی ہے
میں اپنی گدڑی میں سمٹا آنکھوں کی تان لگاتا ہوں

آنکھیں ہیں چھپی لب خشک ہوئے اور جان میری بیجان ہے
یہ صحنِ حرم ہے جس میں پڑا اک جاں ہے وہ لٹواتا ہوں

بن گھر سے بھی اور در سے بھی اور کوہ و دشت و چمن سے بھی
اپنوں سے پرایوں سے ہٹ کر محبوب کی راہ بناتا ہوں

محبوب میرے کے پائے قدس تلوؤں کو جھک کے چومے عرش
آتے ہیں جب اس کٹیا پر نو جانِ جہان بچھاتا ہوں

کوئی ڈھول بجیں کوئی راگ چلیں کوئی کتنا حسین تماشا ہو
میں اپنے پیا کی یادوں میں دن رات خوشی مناتا ہوں

کوئی ہنستے ہیں کوئی روتے ہیں کوئی کھیل میں شور مچاتے ہیں
میں ماہ جبیں کی زلفِ دوتا پر جان کو گھول گھماتا ہوں

بازار کھلے ہیں شہروں میں ہر جا پہ سودے بکتے ہیں
محبوب کے شہرِ عظمیٰ میں میں اپنا آپ بکاتا ہوں

شادی کی گھڑیاں بنتی ہیں جب پیار میں دل آ جاتا ہے
میں شادی دل کی میں رچ کر شادی کو شاد بناتا ہوں

کوئی ہنستے ہیں جب بھاگ بنیں کوئی روتے ہیں جب بھاگ لٹیں   میرا ماہی ہے بھاگ میں سارا جہاں دیکھ قدمن پہ بھاگ بناتا ہوں
جب صبح دم ماہتاب چڑھے مشرق کی بھوری گھاٹی سے   میں صبح ازل کے مطلع کی تنویر کو یاد میں لاتا ہوں
یہ شور مچا ہے چڑیوں کا یہ حسن کھلا ہے گلشن کا   ہر جانب اور ہر گھاٹ سے میں اک حسن زمن ہی پاتا ہوں
کوئی گیت نہیں کوئی سُر ہی نہیں طنبور نہیں اور ساز نہیں   ہر گیت کی سُر طنبور کے ساز محبوب کی دھن پہ گاتا ہوں
طوفان چلیں یا اندھیاں ہوں یا برق گرے یا بارش چلے   میرا تو تماشا ایک ہی ہے طیبہ کا طور بناتا ہوں
میں ہر دو منزل ہوں تو سہی پر میری منزل رحمت ہے   اس رحمت کل کی منزل پر میں قدم پہ قدم بڑھاتا ہوں
آدم کی جبیں حوا کا حسن غمزوں کے اشارے بنتے ہیں   میں آپنی آنکھ اشاروں پر محبوب کے خوب رلاتا ہوں
یہ لعل و گوہر یہ چُنے سب یاقوت ہوں ہیرے موتی سب   الماس بھی سنگ پارس بھی قدموں پہ آن لٹاتا ہوں
شاہان جہاں کی سطوت کو اور حسن کے سب اندازوں کو   شہزادوں کو شہزادیوں کو بس چپا کر نور بناتا ہوں
کوئی کیا جانے کوئی کیا سمجھے کوئی کیا دیکھے اور کیا پائے   جلتے ہیں جہاں سب صدقے میں خود کو دیکھ صدقا تا ہوں

حضرت پیر صاحب دیول شریف ۔

مُسلم کی پہچان

عظمتِ قرآن

زندگی کی زیب و زینت کے لیے قرآن ہے
جو وجودِ ذاتِ باری کے لئے برہان ہے

غمگسارِ آب و گل اس ذات کا فرمان ہے
ایک اُمّی پر جو اترا ہے وہی قرآن ہے

نقطہ نقطہ کے لئے بیکل ہے قلبِ مضطرب
جس قدر کھو جاؤں اس میں وسعتِ ایمان ہے

ژالہ باری چشمِ تر سے ہے نظرِ قرآن پر
اہلِ دل، اہلِ نظر کی بس یہی پہچان ہے

آخرِ دم بھی نظر ہے سورۂ اخلاص پر
مژدہ اے ذوقِ نظر منزل بہت آسان ہے

تیری رحمت کے میں صدقے نعمتِ قرآن دی
ذرّۂ خاکی پہ تیرا کس قدر احسان ہے

اور شائیں بھی تیری بخشش ہیں تیرا لطف ہیں
نورِ عرفاں ہے کہ جس سے آدمی کی شان ہے

یا قرار آتا ہے دل کو نام لے لے تیرا
یا محمد مصطفےٰ وجہِ سکونِ جان ہے

جگمگاتے رہتے ہیں جلوؤں کے معین اکثر یہاں
طورِ سینا ہے کہ یہ دل وادیٔ فاران ہے

صاحبزادہ پیر روح الحسنین معین

پیش لفظ

۱۳۸۷ھ ہجری مطابق ۱۹۶۸ء اس لحاظ سے قابل صد افتخار رسال ہے کہ اس میں دنیا بھر کے مسلمانوں نے قرآن مقدس کی چودہ سو سالہ تقریب کا جشن پوری آب و تاب سے منایا۔ یہ ایک مبارک ترین اقدام ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان قوم اپنی آسمانی کتاب سے کس قدر والہانہ عقیدت کی حامل ہے۔ تقریباً نصف صدی کی بات ہے جب مسلمانوں میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر مجالس کے انعقاد کی تحریک شروع ہوئی تو بکثرت عالم اسلام میں اس مستحسن اقدام کا خیر مقدم ہوا اور ہر سال مسلمان بڑے والہانہ اور پر جوش انداز میں میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریبات کا اہتمام کرتے ہیں جن میں قرآن و حدیث کی روشنی میں نبی پاک صاحب لولاک حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر بڑے عالمانہ اور فاضلانہ طور پر وعظ و نصیحت ہوتی ہے اور سرکار دو عالمؐ کی تاریخ کو دہرایا جاتا ہے۔ اور سب مسلمان خاص طور پر علماء اسلام اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خالق کائنات کو اپنے حبیب پاکؐ سے کس قدر پیار ہے۔ اپنے اپنے خطبات میں علماء یہ ثابت کرنے کی بلیغ ترین کوشش کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ اگر اپنے محبوب کو پیدا نہ فرماتے تو پھر کوئی چیز بھی نہ ہوتی۔ اس کے لئے ایسی قرآنی آیات کو موضوع بنایا جاتا ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے حبیب پاک کو بڑے بڑے القابات سے نوازا ہے اور احادیث قدسیہ کے مستند حوالہ جات سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ حضور پاکؐ کی ذات ستودہ صفات ہی باعث تخلیق کائنات

ہے۔ یہاں تک کہ حدیث شریف کے حوالہ جات سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا نہ فرماتے تو اپنی ربوبیت کا بھی اظہار نہ کرتے۔ قرآن و حدیث کے جملہ حوالہ جات سب کے سب قرین فطرت ہیں کیونکہ انسانیت کا ہر محبوب ہی انسانیت کے لئے مقصودِ نظر ہوتا ہے۔ جو جو چیزیں محبوب ہیں وہی تحریکات کا ذریعہ بنتی ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ انسان کے لئے کوئی نہ کوئی چیز محبوب ہوتی ہے جس کے لئے وہ اپنے آپ کو سرگرم عمل رکھتا ہے۔ اگر محبوب و مرغوب چیزیں نہ ہوں تو یقیناً انسانیت میں سرگرمیٔ عمل مفقود ہو جائے۔ یقیناً صحابہ کرام سے لے کر آج تک مسلمانانِ عالم خدا کے بعد سب سے زیادہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت و عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔

یوں کہا جائے کہ اسلام کی تحریکِ عمل کی اساس اوّل مصطفٰے علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات ہے تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ اتنی بڑی محبوب ہستی اپنے ساتھ جو آئین فطرت لائی وہ آئین بھی مسلمان قوم کے لئے اتنا ہی محبوب ہے جتنا کہ خدا اور اس کے رسول مقبول محبوب ہیں۔ وہ آئین فطرت قرآن مجید فرقان حمید برہان رشید ہے۔ جشنِ میلاد النبی کی تحریک نے جشن نزول قرآن کا بھی ۱۳۸۷ ہجری میں آغاز کر دیا۔ چنانچہ ۱۹۶۸ء میں دنیائے اسلام میں جو اہم اجتماعات ہوئے ان میں غالباً سب سے اہم ترین وہ اجتماع تھا جو دس فروری کو اسلام آباد میں شروع ہوا جس میں مسلم دنیا کے عظیم مفکرین اور دانشوروں اور عہد جدید کے علماء و محققین اور اکابر علماء و مشائخ نے بھرپور شرکت فرمائی۔ تاجدار دو عالم رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے توسل سے انسانیت کی رہنمائی کے لئے خدائے بزرگ و برتر کے عطا کردہ آئین زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ہر مکتب فکر کے لوگوں نے اپنی مایہ ناز تحاریر اور تقاریر کے ساتھ اس صحیفہ آسمانی پر روشنی ڈالی اور خراج عقیدت پیش کیا۔

عمدۃ العارفین سراج السالکین برہان المحققین مرشد پاکستان خواجہ خواجگان اعلیٰحضرت شیخ المشائخ محمد عبد المجید احمد پیر صاحب آف دیول شریف کا نام نامی اور اسم گرامی بھی ان باکمال ہستیوں اور شخصیتوں میں سر فہرست تھا۔ زیر نظر تصنیف فلسفۂ قرآن حضرت ممدوح کے تیرہ عالی قدر مضامین کا مجموعہ ہے جو حضرت قبلہ و کعبہ نے اس تقریب جشن نزول پاک کے دوران تحریر فرمائی جو اسلامی فلسفہ حیات اور انسانی فلسفہ حیات کا بلند ترین مینارۂ نور ہے اور فلسفۂ حیات کا لب لباب اور نچوڑ ہے۔ اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ دنیا میں اسلام اور قرآن کی سب سے زیادہ خدمت اہل نظر اولیاء اللہ نے اور ان کے بلیغ النظر ارادتمندوں نے انجام دی۔ قرآن مجید کی تعلیمات کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچانے اور احیاء دین کے لئے علماء اعلام اور صوفیاء عظام نے مایہ ناز خدمات انجام دیں۔ فی الحقیقت ان مقدسین کے کارناموں کی صدائے بازگشت سے دنیا بھر کے مسلمان دین کی ابدی نعمتوں کے حامل بن گئے۔ حضرت قبلہ پیر صاحب دیول شریف ملتِ اسلامیہ کی روحانی، مادی اصلاح کرنے اور ملت کو راہ راست پر چلانے اور اتحاد بین المسلمین کے لئے ملت اسلامیہ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب تر کرنے کے لئے موجودہ دور میں ایک وسیلۂ اعظم ہیں۔ آپ لوگوں کے دلوں میں خداوند تعالےٰ اور مصطفےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت کی قندیلیں روشن کر رہے ہیں اور ملت اسلامیہ کو اسلام کے لئے ایثار و محبت کا درس دے رہے ہیں۔ آپ نے اس کتاب کے پُر از حقائق مضامین میں قرآن حکیم کی جامعیت اور مالغیت کو اس کی اخلاقی تعلیمات کو کہیں اشاروں سے اور کہیں کنایوں، کہیں برملا اور کہیں تمثیلات میں ایسے احسن طریق سے رقم فرمایا جس کو پڑھنے والے کی خفتہ صلاحیتیں جاگ اٹھتی ہیں اور دل اسلام کی اطاعت سے سرشار ہو جاتا ہے۔ آپ نے اپنی اس تصنیف میں ثابت کر دیا ہے

کہ قرآن مجید فرقان حمید سے بہتر انسانیت کے لئے کوئی دستور العمل اور دستور حیات نہیں ہے اور نہ ہی آئندہ قیامت تک ایسا دستور بنایا جاسکتا ہے۔ قرآن مجید بنی نوع انسان کے لئے ایک ہمہ گیر قانون اور ایک زبردست تحریک عمل ہے قرآن کریم منبع اعظم ہے جس کی ابتدا و انتہا کسی نے نہیں پائی۔ قرآن معبودان باطل کی طرف سے انسانیت کا منہ موڑ کر خدائے وحدہٗ لاشریک کی جانب پھیر دیتا ہے۔

اس کا مقصد اولین انسانیت کے سامنے نظریہ توحید پیش کرنا اور منوانا ہے۔ نظریہ توحید و رسالت کے ساتھ قرآن مجید ہی مسلمانوں کی مادی اور روحانی ترقی کا آخری ذریعہ ہے۔ قرآن مجید میں وہ تمام آداب اور اصول حکمت موجود ہیں جس کی ضرورت ہر زمانہ میں انسانیت کو رہے گی۔ قرآن قطعی طور پر ایک عملی مذہب پیش کرتا ہے جس کے بغیر دنیا میں امن و امان قائم نہیں ہو سکتا۔

دنیا میں صرف اور صرف قرآن ہی ایک ایسا قانون فطرت ہے جس کے ذریعے انسان بیک وقت روحانی و مادی ترقی پا سکتا ہے۔ قرآن مجید قدیم وجدید صداقتوں اور حقیقتوں کا مظہر اتم ہے۔ جو محض ایک تخیل نہیں بلکہ ایک مستقل لائحہ عمل ہے یہی وجہ تھی کہ اس کی تعلیمات نے دنیا میں سب سے بڑا اور عظیم انقلاب بپا کر دیا، اور جہاں اپنے پیروکاروں کی راہنمائی کرتا رہا ہے وہاں ساری انسانیت کو دعوت حق دیتا رہا جس کی دعوت حق سے صدیوں کی گمراہیاں لمحوں میں کافور ہو گئیں۔ قرآن مجید انسانیت کو فطری قرینوں پر سلطنت کرنے کے آداب بتاتا ہے اور ہر مسلمان کی صحیح اور فطری رہنمائی کرتا ہے۔ اس میں ایک حقیقی جمہوریت کے لئے کامل ترین حل موجود ہے اس کی جمہوریت کا اولین و آخرین مقصد مساوات ہے ایسی مساوات جس میں عدل گستری موجود ہو، جس کی موجودگی میں نہ کسی کا حق چھینا جائے اور نہ کسی کا حق چھیننے دیا جائے۔ ابنائے ریاست ایک ہی آئین کی عاطفت میں کاروبار دنیا میں شریک ہو

سکیں۔ قرآن مجید اپنی جماعت اسلام کو جمہوری ریاست میں سب سے زیادہ دیانت داری کی تعلیم دیتا ہے۔ تاکہ مدعیان اسلام اپنی صداقتوں کے ساتھ ریاست کے غیر مسلمین پر اتنی زیادہ عاطفت کریں اور اُن سے انصاف کا پرچار کریں کہیں جزوی طور پر بھی ریاست کے شہریوں کی حق تلفی نہ ہو۔ قرآن مجید کی جمہوری سیاست کا ترجمہ حسن انتظام کے ساتھ ریاست پر حکمرانی کے فرائض انجام دینا ہے۔

چونکہ مادہ پرست جمہوریتیں حسن انتظام کے برعکس حسن کذب سے کام لیتی ہیں اور حسین جھوٹ بول کر اپنی حکمرانی کے طمطراق کا سکہ لوگوں کے دلوں پر اور ذہنوں پر بٹھاتی ہیں اور اپنا جھوٹا طمطراق قائم رکھتی ہیں۔ اسلام کے نزدیک جھوٹی حکومت پر جمہوریت کا قطعاً اطلاق نہیں ہو سکتا۔ ایسی جمہوری حکومتیں جو راعی اور رعایا دونوں کے لئے کافی وافی ہوں اسلامی جمہوریت کے مطابق پوری دنیا میں ایک ہی صالح حکومت ہونی چاہیئے جس کا ایک ہی امیر اور ایک ہی صدر یا ایک ہی وزیر اعظم ہونا چاہیئے۔ صدارتی طرزِ حکومت اسلامی جمہوریت کے قرین قیاس ہے اس کا حلیہ نظام خلافت سے ملتا جلتا ہے۔ اس لئے کہ قرآن کا قانون اصول فطرت کے مطابق فلاح انسانیت کے لئے عالمگیر حکومت کے ساتھ امن و عافیت چاہتا ہے جس کے ساتھ مسلمانوں کو سارے جہان کے انسانوں پر امامت و خلافت کا موقعہ ملتا ہے۔ دین فطرت دین کامل کی صورت میں آخری جمہوریت کے ساتھ آچکا ہے اور نافذ بھی ہو چکا ہے۔

اس دینی تبلیغی تقاضے کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے زمانے میں پورا کر دیا۔ دین کامل کو اسلام کی صورت میں اپنی امت کے ہاتھوں دے دیا خلفائے راشدین نے اسی نظام فطرت کو باقاعدہ اور باضابطہ نافذ کر کے بنی نوع انسان کے سامنے اسلام کے عادلانہ نظام کا لوہا منوا لیا۔ جس نظام نے اپنی فطری صداقتوں کے ساتھ سارے ادیان عالم پر باکمال غلبہ حاصل کیا۔ آج بھی پوری انسانیت اس نظام کی متمنی و منتظر ہے۔ وہی

شمس و قمر اور کواکب گردش میں ہیں اور وہی اولاد آدم زیر سما سینہ گیتی پر چل پھر رہی ہے اور با فراغت کھا پی رہی ہے وہی اسلام کتاب و سنت کی صورت میں آج بھی مسلمانانِ عالم کو ایک خدا، ایک رسول ایک قبلہ کی عاطفت میں اعمال صالحہ کی بجا آوری کی دعوت دے رہا ہے یہ کہ سب مسلمان ایک تبلیغ صالحہ اور تنظیم کامل اعلائے کلمۃ الحق کی دعوت دے رہا ہے۔ یہ کہ سب مسلمان ایک تبلیغ صالحہ اور تنظیم کامل کیساتھ اعلائے کلمۃ الحق کی ضرورت کو پوری طرح محسوس کریں اور میدان عمل میں آ کر آئیں اس طرح ناکامیوں کی جگہ کامیابیوں اور کامرانیوں کو لائیں کہ دین کا وہ غلبہ جو باہمی تفریق کا شکار ہو کر ضعیف تر ہو چکا ہے پھر اپنی اصلی قوت و طاقت کے ساتھ لوٹ آئے اور موجودہ دور کے مسلمان اسلام کی نشاۃ ثانیہ کو حاصل کر سکیں۔

مذکورہ بالا تصنیف لطیف اپنی جامعیت اور افادیت اور تاثر و تاثیر کے اعتبار سے زمانے بھر میں اپنی مثال آپ ہے۔ ضرورت ہے کہ اس باعظمت کتاب کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور دوسری بین الاقوامی زبانوں میں بھی اسکا ترجمہ ہو تاکہ انسانیت کے سامنے قرآن مجید کی عظمت کا صحیح مفہوم واضح ہو سکے۔

دلی دعا ہے کہ رب کعبہ و رب محمد صلی اللہ علیہ وسلم مرشد پاکستان کے فیض دینی و فیض روحانی کو عام کرے اور اس سلسلۂ تبلیغ و اشاعت کو ابد الآباد تک قائم و دائم رکھے۔

آمین ثم آمین

صاحبزادہ پیر روح الحسنین معین
خلف الرشید پیر صاحب دیول شریف

قرآن مجید کا نزول مبارک رات میں ہوا

قرآن مجید
خدا کا کلام ہے جو کلام الٰہی
ضابطۂ حیاتِ انسانی بصورت کتاب اُترا ہے۔

قرآن مجید رمضان المبارک کے ماہِ طیبہ میں لوحِ محفوظ سے آسمان دنیا پر جملۃً واحدۃً نازل ہوا۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً ضرورت اور حالات کے مطابق سرورِ کائنات، فخرِ موجودات علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہوتا رہا۔ ارشاد ہوا:

"شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ"

ماہِ رمضان وہ ہے جس میں قرآن مجید اتارا گیا، پھر فرمایا:

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ط

ہم نے اس کو مبارک رات میں اتارا، پھر فرمایا:

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ

ہم نے اس کو عزت والی رات میں اتارا۔

مذکورہ تینوں آیات میں قرآن مجید کا نزول ماہ رمضان المبارک ہی میں ثابت ہوتا ہے۔ لیلۃ القدر اور لیلۃ المبارکہ سے ایک ہی رات یعنی لیلۃ القدر مراد ہے اور لیلۃ القدر ماہِ رمضان المبارک ہی کی ایک رات ہے۔ یہ رات خارج از رمضان نہیں ہو سکتی۔ ماہ رمضان اپنے ایام معینہ اور اوقات معیّنہ اور اپنے لیل و نہار کے لحاظ سے جزواً و کلاً رمضان المبارک ہے۔ صرف صوم کا خیط الابیض یعنی صبح کی سپیدی سے لے کر غسق الیل تک ہے یعنی مغرب کی پہلی سیاہی تک باقی اوقات مع صوم تابع رمضان ہیں۔ اس اعتبار سے ماہِ رمضان المبارک کے کسی وقت میں جب بھی قرآن نازل ہوا اس زمانۂ نزول سے رمضان المبارک کا مہینہ ہی مراد لیا جائے گا لہٰذا اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اور اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ سے شہر رمضان ہی مراد ہوگا۔ اس

کے لئے واضح دلیل یہ ہے کہ شہر رمضان کی آیت میں قرآن مجید کا نام بیان کیا گیا ہے۔ "أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ" یعنی ماہ رمضان میں قرآن مجید اتارا گیا۔ ان دونوں آیات میں "أَنزَلْنَاهُ" میں ہ کی ضمیر بیان کر کے اس قرآن کی طرف اشارہ کیا ہے جو رمضان میں نازل ہوا چنانچہ یہ دونوں آیتیں بھی شہر رمضان میں نزول قرآن مجید کی تصدیق کرتی ہیں۔

جہاں تک لیلۃ القدر کی عزت و حرمت کا مسئلہ ہے۔ اپنے مقام پر بجا ہے۔ لیلۃ القدر کی فضیلت قرآن و حدیث دونوں میں بیان کی گئی ہے۔ مگر نزول قرآن مجید کے اعتبار سے قرآن مجید کے تین مدارج ہیں۔ ایک قرآن کا لوح محفوظ میں رکھنا، دوسرا لوح محفوظ سے آسمان دنیا پہ ایک وقت میں سارے کا سارا نازل ہونا۔ تیسرا نزول علی الارض، اس مخصوص طبقۂ زمین پر جہاں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم بعثتِ نبوت سے وصالِ مبارک تک رہے۔ ان جملہ تراتیب نزول کا منتہائے مقبول نزولِ قرآن علی نبی آخر الزمان علیہ الصلوٰۃ والسلام تھا اور آپ کے معتبر ذریعے سے انسانیت تک پہنچانا مقصود تھا۔ جملۃً واحدۃً رمضان المبارک کے لیلۃ القدر میں لوح محفوظ سے آسمانِ دنیا پر اور آسمان دنیا سے وقتاً فوقتاً اس دنیا میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا رہا۔ منکرینِ اسلام نے اعتراض کیا تھا کہ قرآن مجید ایک ساتھ سارے کا سارا نازل کیوں نہیں ہوا۔ اس کے جواب میں فرمایا:۔ "لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا" یعنی اس واسطے اس کو اکٹھا نازل نہیں کیا تاکہ آپ کا دل مضبوط اور برقرار رہے یہ ظاہر ہے کہ قرآن مجید کے نزول کا مطلب انسانیت کے لیے ہدایت تھا، نہ کہ نزولِ محض۔ نزول محض سے افادیت کا مقصود مخصوص نہیں ہو سکتا۔ هُدًى لِّلنَّاسِ کا ترجمہ انسانی معاشرہ کے جزوی و کلی اصلاح کے ساتھ رہنمائی ہے۔ فطرتاً انسانی

ذہن فرداً یا اجتماعاً کسی طرح بھی ایک عظیم نصابِ تعلیم کا یکمشت متحمل نہیں ہو سکتا۔
یہ ایک فطری قاعدہ ہے کہ انسان تدریج کے ساتھ علمی و عملی مدارج طے کر کے ارتقاء پاتا ہے۔ یہ ترتیبِ تعلیم انسانیت کی فطری خصوصیت ہے چنانچہ پروردگار عالم نے اس حکمت و علم کے پیشِ نظر اپنے آخری رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر آخری آئین فطرت یعنی قرآن مجید وقتاً فوقتاً موقع و محل کے لحاظ سے نازل فرمایا تاکہ لوگ اسے ذہن نشین کرتے چلے جائیں اور ذہن نشین کرنے کی حالت بھی ایسی ہو جب انسانیت کا ایک ذہنی مقدمہ اعتراض یا ضروری سوال یا ضروری بدّت کے مطابق ہو اور وہ مقدمہ ذہن سے اٹھ کر مجلس تک پہنچ جائے۔ اور مجلس سے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے جو مسئول وقت ہیں اور پھر سائلین کو جواب کا بے قراری سے انتظار ہو رہا ہو۔

ایسی حالت میں جو بھی جواب آئے گا، انکار و تصدیق دونوں حالتوں میں اس کا معاشرہ میں زیر بحث آنا ضروری ہو جاتا ہے اور اس حکمت سے جوابات معاشرے میں نافذ کی جائے وہ زیادہ سے زیادہ یاد رہتی ہے۔ دوسری صورت قلبی و ذہنی اعتراضات کی ہوتی ہے جو نبیؐ اللہ کے خلاف لوگوں کے دلوں اور ذہنوں میں خاموشی کے ساتھ اٹھتے ہیں اور ان کا معترضانہ سکوت جواب کا مطالبہ کرتا ہے یا ایک صورت سرگوشیوں کی ہوتی ہے جو منکرین اپنی مجالس میں بطور استہزا کرتے ہیں۔ ان جملہ حالات میں مخالفین جواب کے طلب گار ہوتے ہیں۔

چنانچہ جب خفی و جلی حالات و مقدمات کا الہامی کتاب کے ساتھ جواب دیا جائے تو یقیناً ایسے مقدمات کے فیصلے عجیب و غریب ہونے کی بنیاد پر یاد رہتے ہیں۔ معترضین کے لئے یہ یادگاری فیصلے ہدایت ثابت ہوتے ہیں اھ

منکرین کے لئے استدلال بن کر دعوت حق کا قطعی ثبوت ہو جاتے ہیں۔ اس تدریجی نزول کی حکمت یہی ہو سکتی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اطمینان وحی کے ساتھ انسانیت کو ہدایت سے مطمئن کر سکیں۔ قرآن مجید خدا کا کلام ہے جو بصورت کتاب اترا ہے کلام الٰہی ضابطۂ حیاتِ انسانی ہے اس کا ابدالآباد تک بصورتِ کتاب رہنا ضروری تھا تاکہ انسانیت ہمیشہ اس سے ہدایت پاتی رہے۔

یہ کتاب، کتاب موعود ہے جس کا اللہ تعالےٰ نے وعدہ کیا ہوا تھا اور اپنے وعدے کو پورا کرتے ہوئے فرمایا:

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

"یہ وہ کتاب موعود ہے جس کا وعدہ کیا گیا تھا۔ وہ نازل ہو چکی ہے جس کی صداقت وحقانیت میں کوئی شبہ نہیں۔ یہ کتاب بالخصوص متقیانِ اسلام کے لئے ہدایت ہے، جو اللہ تعالےٰ پر بن دیکھے، بن مس کئے، بن ٹٹولے ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں انفاق مال کرتے ہیں اور اس کتاب کے علاوہ پہلی کتابوں، زبور، توراۃ، انجیل وغیرہ پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور وہ آخرت پر بھی ایمان رکھتے ہیں، یہ لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

اس کے علاوہ جو لوگ ان عقائد کے خلاف ہیں، یعنی نزول قرآن پر اور اس کی بتائی ہوئی ہدایت پر ایمان نہیں لاتے وہ کافر ہیں۔ وہ دیدہ دانستہ خدا کی حقانیت اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے راستہ سے راہ فرار ڈھونڈتے ہیں۔ لہٰذا ان کو ڈرانا نہ ڈرانا دونوں برابر ہیں کیوں کہ وہ تجاہلِ عارفانہ کرتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ نبیؐ اور اس کی لائی ہوئی ہدایت حق ہے مگر پھر بھی اپنے خبثِ باطن کے باعث انکار پر بضد ہیں۔

یہ لوگ جن کے دلوں پر اور کانوں پر اور آنکھوں پر مہر کر دی گئی ہے۔ نزولِ قرآن مجید نے حق و باطل کی ختمی نشاندہی کر دی۔ اس واسطے کہ قرآن مجید نزول البیان ہے۔ بیان اس کو کہتے ہیں جو حق و باطل میں تمیز کا ذریعہ ہو یعنی وہ ہر طرح ہر صورت باطل کی تردید کرتا ہو اور ہر طرح حق و صداقت کے اثبات میں دلیل لاتا ہو۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ

انسان کو پیدا فرمایا اور ایسے صاحبِ بیان یعنی حق و باطل کی تمیز کرنے والا بنایا۔ قرآن مجید وہ بیان ہے جس کے ذریعے انسانیت کے لئے ہدایت کا تعین ہو اور اس کی ختمی ہدایت کے ذریعے باطل کی ختمی طور پر تردید ہوتی ہو۔ تدریج سے نازل ہو کر ہدایت کا باعث ہوتی ہو۔ اور یہ وہ کتاب ہے جو ہمیشہ کے لئے غیر مبدّل ہے اس میں کبھی تغیّر و تبدّل نہیں ہو گا۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ ۞

ہم نے ہی قرآن مجید کو نازل فرمایا اور ہم ہی اس کے ہمیشہ کے لئے نگہبان ہیں۔ اس آیت سے قرآن مجید کا نزول ابدی ثابت ہوا۔ قرآن کریم اپنی اجمالی صورت کی خود تفصیل ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ وَفَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا اس آیت میں قرآن مجید کا مفصل ہونا ثابت ہے۔ یہ تفصیل آسانی سے ہدایت پانے کے لئے ہے۔ اس کے نزول کا مقصد تبلیغ ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ ط

اے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ ہم نے آپ پر نازل کیا اس کو لوگوں تک پہنچاؤ۔ یعنی اقوال و اعمال کے لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو۔ لوگوں کو اچھائی کی طرف بلاؤ اور برائی سے منع کرو۔ یہی طریقۂ تبلیغ اُمّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

کے علماء کے لئے تجویز کیا اور فرمایا:۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۔ یعنی امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک ایسے گروہ کا ہونا ضروری ہے جو تم کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرے اور پھر یہی طریق تبلیغ عام امت کے لئے تجویز کیا اور فرمایا: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۔

اے امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم ہی سب اُمتوں میں سے بہتر اُمّت ہو۔ اس واسطے بہتر امّت ہو کہ تم لوگوں کو نیکی کی طرف بلاتے اور برائی سے منع کرتے ہو ان آیات سے معلوم ہوا کہ نزول قرآن مجید جماعت کے ساتھ تبلیغ چاہتا ہے اور جماعت کی تخلیق کرتا ہے اور قرآن مجید کی جماعت اُمت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے جو اپنے ختمی رسول اور ان کی ختمی ہدایت کے ساتھ عقائد، ختمی عبادات، ختمی معاملات، معاشرت اور ختمی اخلاقیات رکھتی ہے اور یہ سب کچھ اُسے کتاب وسُنّت سے ملا ہے۔ نزول قرآن آیاتِ جمیلہ کا مجموعہ ہے جس کی عملی وعلمی تفسیر، تشریح وتوضیح احادیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم کرتی ہیں۔ چوں کہ نزول قرآن کا مقصد ہدایت النّاس تھا اور نزول من جانب اللہ ہو رہا تھا۔ اور اس کے قاریٔ اوّل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے۔ آپؐ پر لازم تھا کہ آیات کا شانِ نزول بیان کریں اور اس کے نزول کا مقصد بیان کریں اور جن امور و اعمال کے لئے آیات نازل ہو رہی ہیں اُن کا صحیح تعین کریں۔ یہ ظاہر ہے کہ اس کے لئے اسی قسم کی بات کرنی ہوگی جیسا کہ اس کے کرنے کا حکم ہے۔ ایک تو کلام الہٰی کی آیات ہیں جو آیاتِ جلیہ کی صورت میں نازل ہو رہی ہیں اور وہ قرآن مجید ہیں جن کو کسی طرح بھی کسی دوسری کلام کا جزو نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ نہ یہ

کہا جا سکتا ہے کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے حالانکہ بن دیکھے خدا کا کلام بن دیکھی حالت میں بذریعہ وحی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہو رہا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی اس کے مصدق و مبین ہیں اور فرماتے جاتے ہیں کہ یہ کلام جس کی قرأت کر رہا ہوں اللہ کی جانب سے بذریعہ وحی مجھ پر نازل ہوا ہے۔ کلام اللہ کا ہے مگر صوت کی صورت میں وہ کلام رسول کا مقام بھی پا رہا ہے لہٰذا ایسی حالت میں نزول کلام الٰہی کے ساتھ ساتھ اور قرأت کلام پاک کے ساتھ بیان پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو الگ حیثیت دینے کی بھی اشد ضرورت تھی تاکہ قرآن مجید کو الگ کلام الٰہی کی صورت دی جائے اور کلام نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو الگ مقام دیا جائے چنانچہ :-

مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝

فرما کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث لسانی کی وضاحت فرما دی اور نطق نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم مبرا عَنِ الْهَوٰی النفس قرار دے کر معیار کی حیثیت رکھتی ہے اور نزولِ قرآنِ مجید کے ساتھ بالوحی ترجمان کی حیثیت رکھتی ہے تاکہ کوئی شبہ نہ کر سکے۔

اسلام میں اس قسم کے کلام کو حدیث رسول کہا جاتا ہے اور وہ آیاتِ خفیّہ کی حیثیت میں ہیں۔ آیاتِ جلیہ کا ترجمہ آیات خفیّہ کے ذریعہ ہی زیادہ معتبر ہو سکتا ہے۔ لہٰذا امت محمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے ضروری ہوا کہ وہ احادیث شریفہ کو آیات الٰہیہ کے ساتھ تسلیم کرتے ہوئے جماعت بندی کریں۔ آیاتِ جلیہ کتاب الٰہی اور آیاتِ خفیہ سُنّت ہوئیں۔ امتِ محمدیہ کیلئے کتاب و سُنت پر ایمان رکھنا ضروری ہوا۔ قرآن مجید کی نزولی حیثیات کی حفاظت نزولِ احادیث کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ صاحبِ حدیث

علیہ الصلوٰۃ والسلام آیات کی نزولی نوعیت کی وقتی حالت سے خبردار ہیں۔

شانِ نزول کے ساتھ ساتھ آیات کی تبلیغ کی ذمہ داری بھی آپؐ پہ ہے اور آیاتِ کا سمجھنا بھی آپؐ ہی کے ذمہ ہے اور ایسی حالت میں خدانخواستہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی ان احادیث کو جو اللہ کی طرف سے ترجمانی کیلئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اتر رہی تھیں ذریعۂ تفہیم نہ بناتے تو عوام الناس کلام خدا کو کیونکر سمجھتے۔ اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نزولِ آیات کو صرف مکہ اور مدینہ کے کسی مرکزی مقام سے پڑھ کر سُنا دیتے اور لکھ کر لوگوں کے در و دیوار پہ لگا دیتے۔ معترضانہ سوالات کا جواب اپنے نطقِ مبارک یعنی حدیث شریف کے ساتھ نہ دیتے جو اس کلام کو جسے صرف نبیؐ اللہ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ دوسروں کے لئے بغیر حدیث کے سمجھنا عقلِ سلیم کے نزدیک محال ہے۔

اگر عام ہادیوں کا کلام بھی عوام کے لئے تشریح طلب ہو سکتا ہے تو پروردگارِ عالم کا کلام کیونکر تفسیر طلب نہ ہوگا۔ بالخصوص قرآن مجید کی تفسیر وہی ذات کر سکتی ہے جس پہ قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ اس فطری اصول کے پیشِ نظر سُنّت کا تعین کتاب کے ساتھ ضروری تھا تاکہ کتاب و سُنّت لازم و ملزوم کی حیثیت سے جماعتِ محمدیہ کے ساتھ بصورتِ آئین ہمیشہ جاری و ساری رہے نزولِ قرآن مجید اللہ کی طرف سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پہ ہوا۔ اور اس کا نزول عالمِ اسباب میں ہوا اور عالمِ اسباب کے ذی شعور اور ذی کرامت گروہ انسانی کی طرف ہوا۔ اس کے لانے والے انسانیت کے مُونس سرور کائنات رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جس کتاب کا بھیجنے والا خدا ہو اور وصول کرنے والے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم ہوں۔ اور جبرئیلِ امین جیسی عظیم المقام شخصیت قاصد کے فرائض انجام دے رہی ہو اور انسانیت جیسی مکرّم جماعت کیلئے

اُتر رہا ہو۔ ایسی کتاب کے ختمی آئینِ انسانیت ہونے میں کیا شُبہ ہو سکتا ہے۔
یہ وہ کتاب مقدس ہے جس کی پُر جلال جامعیّت کا یہ عالم ہے کہ اگر اس کا نزول پہاڑوں پر ہوتا تو وہ اس کی دہشت اور جلالت سے ریزہ ریزہ ہو جاتے انسانوں کی جماعت میں وہ جماعت کتنی خوش نصیب ہے جس نے کتاب خداوند ذوالجلال کو آخری رسولِ خُدا کے اعتبار پر تسلیم کیا اور اس نے دین اسلام کی جماعت میں شامل ہو کر کتاب وسُنّت کی پیروی کی اور خیرالامت ہونے کا اس نے شرف پایا ہو اور اس کو خیرالامّت ہو کر اعلائے کلمۃ الحق یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے کی دعوت دی گئی ہو۔
کتاب وسنت کے عالم اسباب میں آنے کا مقصد عظیم یہ ہے کہ دین اسلام کی جماعت آئینِ فطرت کی روشنی میں زمان ومکان کا علم حاصل کرے۔ انفس و آفاق پر اللہ تعالےٰ کا بندہ ہونے کی حیثیت سے ژرف نگاہی سے نظر ڈالے اپنے خالق کی گوناگوں کرشمہ سازیوں کو سمجھے، ہیبت انگیز حالت سے رِقّت حاصل کرے۔ اپنی روح کو اللہ کی یاد سے مطمئن کرتا ہوا انفس و آفاق پر چھا جائے اور تسخیر روحانیّت کے ساتھ تسخیرِ کائنات کرتا ہوا انسانیّت کو اس کی کامل خدمت کے ساتھ دعوتِ حق دیتا ہوا حقیقتِ حقہ کے سامنے سربسجود ہو جائے۔

قرآنِ مجید اور تاریخ

قرآنِ مجید ازلی ابدی تاریخ کی روشنی میں بندوں
کو حمدِ باری تعالےٰ اور ذکرِ الٰہی کی تعلیم دیتا ہے افکار
وافعال انبیآ وصالحین پر عملی تاریخ مرتب کرنیکی تعلیم
دیتا ہے تاریخ انسانیّت کی یہ وہ فطری صراط ہے
جسکی ابتدا عملو الصلحات سے ہوتی ہے اور جسکی انتہا
آخرت میں جنت الفردوس کی دائمی راحتوں سے ہمکنار
ہوجاتی ہے ایام اللہ خدا کی تاریخ ہے ادیان و
اقوام کی تاریخ۔ تاریخ عمل کا دوسرا نام ہے سب
سے بہتر وہی تاریخ ہوگی جو فطری اعمالِ صالحہ
سے آراستہ وپیراستہ ہو حقیقت میں وہ تاریخ انبیا
ومرسلین کی تاریخ ہے

قرآن مجید خود ایسی تاریخ ہے جو ازل تا ابد تاریخ دنیا اور تاریخ عقبیٰ پر مشتمل ہے

قرآنِ مجید کے سیاق و سباق پر سیر حاصل تبصرہ کرنے کے بعد صاف طور پر وضاحت ہو جاتی ہے کہ یہ تاریخ ایک قولِ فیصل کی حیثیت رکھتی ہے کوئی تاریخ صرف روداد اعمال پر قولِ فیصل نہیں بن سکتی چونکہ اس کے غیر صحت مند ہونے کے متعلق آنیوالے حالات کے مطابق تنقید کی جا سکتی ہے قولِ فیصل وہ ہو سکتا ہے جو خدا کی طرف سے قطعی ہو۔ قرآنِ مجید وہ تاریخ ہے جس میں وہ واقعات جو برگزیدہ شخصیات سے صادر ہوئے من و عن اس میں موجود ہیں اور تمام نیکیوں اور برائیوں کی کماحقہ نشان دہی کرتے ہیں اور ماضی کے حالات کا صحیح ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

قرآنِ مجید فیصلہ الہٰی ہونیکی حیثیت میں علمِ الہٰی کی لازوال اور لامحدود نگاہوں کے ساتھ جو ازل و ابد کو اپنے سامنے رکھ کر بنائی گئی ہیں مرتب ہوا۔ نزول کے اعتبار سے یہ چودہ سو سال قبل نازل ہوا۔ مگر ماضی کے تمام قصص اسمیں موجود ہیں۔ تمام نیک واقعات جو برگزیدہ شخصیات سے صادر ہوئے وہ اس میں موجود ہیں۔ اور وہ تمام برائیاں جو اُن لوگوں کے سامنے آئی ہیں۔ ان سب کو اس میں بیان کر دیا گیا۔

تاریخِ انسانیت کی اُس عملی رودادِ زندگی کا نام ہے جو اس کے صحیح اقوال و افعال پر مرتب ہو کر آنے والے زمانوں کیلئے محفوظ رہے اس حیثیت سے تاریخ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے ایک اچھے لوگوں کے اچھے اعمال کی تصویر کشی۔ دوسرے بُرے لوگوں کی بُرائیوں کی ترجمان ہو کر سامنے آتی ہے

اس اچھائی اور برائی کو ترغیب وترہیب کی صورت میں پیش کرنا تاریخ کے فرائض میں شامل ہے اور تاریخ کا یہی فطری نصب العین ہے جس کے حصول کیلئے انسانی تاریخ کے گوشے اُس وقت بھی انسانیت پر مستور نہ رہ سکے۔ جب انسانیت سراسر جہالت اور بے راہ روی کا شکار تھی۔ جن ادوار میں ظالموں نے اپنے بے جا ظلم وستم کو دبانے کی کوشش کی۔ مگر خاموش اذہان نے ان حالات کو اپنے ذہنوں میں رکھا۔ اور پہلی فرصت میں ان محفوظ ر ردادوں کو صفحۂ قرطاس پر لائے اور ان نیکیوں کو جنہیں ظالموں نے اشاعت میں آنے سے روک رکھا تھا صفحۂ قرطاس پر ظاہر کر دیا۔ برائی جو انسانی افعال بنتی ہیں۔ لامحالہ کسی نہ کسی طرح اُس کو صفحۂ تاریخ پر ظاہر ہونے کا فطرت موقع فراہم کرتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو تاریخ کا لفظ بے معنی ہو جائے۔ اولادِ آدم کی تاریخ معدوم ہوتی مگر معنوی طور پر اس کے کردار...... تاریخ آدمیت بن سکتے ہیں۔ اس تاریخ کے لئے جس موادکی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ حسین و قبیح اعمال ہوتے ہیں۔ تاریخ جن حالات کی تصویر کشی کرتی ہے ان میں عادات، اطوار، رحم وغضب، غربت و امارت، جغرافیائی حیثیات، قوموں کی تہذیب و تمدن اور اُن کی معاشرت، اُن کے مذاہب، اُن کے ضعف و قوت، فردی اور اجتماعی زندگی، امن و صلح، جنگ وجدل، فتح و شکست، خوشی و غمی ازدواجی زندگی، شہری حقوق، رائے عامہ، عدالت، حکومت، عدل وانصاف اور تعلیم و تربیت وغیرہ سب شامل ہیں۔

ہر تاریخ مرتب ہونے سے پہلے مؤرخین کی نظر میں متصور ہونے کے بعد تاریخ بنتی ہے۔ مؤرخین حتی المقدور اس کو حالات کے مطابق صحیح تاریخ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر قدرتی طور پر تاریخ کے بعض حصوں پر عصبیتِ انسانیہ کا رنگ بھی آجاتا ہے۔

چونکہ ہر قوم من حیثُ الجنس برتری چاہتی ہے۔ اور اُس برتری کے لئے اُسے ایک بڑا معیارِ شرافت مہیا کرنا پڑتا ہے جس میں اسے فکر دل کو تخلیقی صنعت دینی پڑتی ہے۔ جو انسانی کمزوری پر محمول ہوتی ہے۔ اور اسی صنعتِ فکری کا تحمل تاریخ کی اصلیت پر پردہ ڈالنے کی سخت ناپاک جسارت ہوتی ہے۔ اس بنا پر تاریخِ انسانیت کا ہر گوشہ آنیوالی نسل انسانیت کی طبیعت کو مزید شک وشبہ کیلئے آمادہ کرتی ہے۔ اس کے مقابلے میں تاریخِ خداوندی کو یہ حق پہنچ سکتا ہے جو عصبیت سے مبرّا ہو کر حقیقی تاریخ کی صُورت میں نوع انسان کے سامنے آئے۔ چونکہ علم خداوندی، فیصلۂ خداوندی، نظرِ خداوندی دست بُردِ عقل انسانی سے مُطلقاً منزہ و مبرّا ہے۔

ان فطری قدروں پر تاریخ مرتب ہو کر اقدارِ تاریخ کا صحیح موازنہ بن کر نظامِ تخلیق سے اپنا آغاز کرتی ہے۔ قرآنِ مجید کی تاریخی حیثیت اللہ کے پہلے عمل کُن سے آغاز کرتی ہے۔ اور "مَا کَانَ وَ مَا یَکُوْنَ" سب کو اپنے دامن میں لیتی ہوئی ان ہی میدانوں سے گزرتی ہے۔ جو اللہ کے علم میں موجود ہوتے ہیں اللہ تعالےٰ کی جملہ تقدیرات قرآن مجید کے قولِ فیصل میں آجاتی ہیں۔ قرآن مجید تاریخ کائنات کو لفظِ ربوبیت کے ساتھ بیان کرتا ہے "سَبْعَ سَمٰوٰت" فرما کر آسمانوں کے سات طبقات کی تاریخ ظاہر کرتا ہے۔ پھر متعلقات آسمان کی تاریخ "وَ لَقَدْ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ" کے ساتھ بیان فرمایا کہ ہم نے آسمانِ دنیا کو روشن چراغوں سے مزین کر دیا۔ پھر زمین و آسمان کی مجموعی تاریخ یوں بیان کرتا ہے۔ "فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا" یعنی زمین کی چھ دن میں تخلیق فرمائی پھر آسمانوں کی طرف توجہ فرمائی ان کو سات طبقات کے سلسلوں پر استوار کر دیا

اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ اس کے بعد تخلیق کے مختلف عنوانات پر روشنی ڈالتا ہے
انسان کے بارے میں عدم سے وجود میں آنے تک اس کی تاریخ پر براحین
تبصرہ کرتا ہے۔ چنانچہ انسان کا ذکر اپنی زبان میں ان تاریخی الفاظ کے ساتھ
بیان کرتا ہے۔ جس کی مثال نہیں مل سکتی۔

" هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ۝ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝

" یعنی انسان پر زمانوں میں سے ایک ایسا زمانہ بھی گزر چکا ہے۔ جب یہ کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر ہم نے اس کو ایک قطرۂ آب سے پیدا کیا۔ اور اس کو سننے والا اور دیکھنے والا کیا۔ اس دیکھنے اور سننے کی صلاحیت کے بعد اس پر ہم نے ہدایت کی۔ دو راہیں واضح کر دیں۔ یعنی کفر و اسلام، چاہے وہ راہِ اسلام پر چلے اور اللہ کی خوشنودی حاصل کرے۔ اور چاہے کفر کا راستہ اختیار کرے اور صراطِ مستقیم سے بھٹک جائے۔"

اس تاریخ انسانیہ پر انسان کی اصلی حیثیت پیش کر کے اپنے اس انعام کا اس کو احساس دیا۔ جو اسے تخلیقاً سمع و بصر کی صورت میں تفویض فرمایا۔ اور اس کو تاریخ یاد دلاتے ہوئے ہدایت پر چلنے کیلئے مکلّف قرار دیا۔ اور کفر و اسلام کے نفع و ضرر سے آگاہ کرنے کے بعد کہ اسلام میں تیری نجات ہے۔ اور انکار میں تیری ہلاکت۔ اس افہام و تفہیم کے بعد انسان کو ان دونوں راہوں میں سے ایک راہ انتخاب کرنیکا اختیار دیا گیا۔ جس کا مطلب عمداً صراطِ مستقیم کو حاصل کرنا ہے۔ اس تاریخی بیان میں انسان کو انتخاب راہ کے لئے امتحان میں ڈالا گیا ہے۔ تاکہ اس کی عقل کا اس کے انتخاب سے اندازہ کیا جائے کہ کیا وہ اپنی تاریخی حیثیت

کے پیشِ نظر عقل سے کام لے رہا ہے یا نہیں۔
چونکہ انتخاب شے، اس کی تاریخی حیثیت کا ترجمان ہوتا ہے۔ کہ وہ عقلِ سفلی سے کام لیتا ہے یا عقلِ علوی سے۔ اس لئے اللہ نے اسے احسن تقویم کے ساتھ علوِ درجات کا مقام بخشا ہے۔ انسانی تاریخ اسے اعلیٰ کام کرنیکی تعلیم دیتی ہے قرآنِ مجید تاریخِ الوہیت کو اس کی ذات کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اور ذات کو مخلوق سے منزّہ قرار دیتے ہوئے اپنی صفات بیان کرتا ہے۔ تاریخ عملِ خداوندی ہی باری تعالےٰ کی مظہر ہے۔ کائنات کے جُملہ خدوخال حُسن قدرت کو نمایاں کرنے کیلئے صحیفۂ فطرت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ تاریخ کی ترتیب تجویزِ خداوند ذوالجلال ہے۔
اس تاریخ کے پیشِ نظر اس کے بیان کردہ ایک مچھر سے لیکر بڑی سے بڑی چیز تک مطالعہ کرنے سے تاریخ کے بیان اور زیرِ مطالعہ چیز میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ جس سے قرآنِ مجید کے ازلی اور ابدی تاریخ ہونیکی بلاشُبہ تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔
"اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْىٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا"
"یعنی اللہ تعالےٰ اپنے کلام میں ایک مچھر جیسی چھوٹی مخلوق سے لیکر سارے جہانوں کی مثال پیش کرنے سے قطعاً شرم محسوس نہیں کرتا۔"
اس آیت میں تاریخِ اشیائے عالمین پر اتنی عمیق اور وسعت پذیر روشنی ڈالی گئی ہے کہ اس میں ایک مچھر جیسی چھوٹی چیز کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ کوئی دُنیا کا مورخ قومی سطح پر من حیث الجنس کسی حقیر واقعہ کو بیان کرنا پسند نہیں کرتا۔ بلکہ چھوٹے ..... واقعات کو بیان کرنا کسرِ نفسی سمجھتا ہے۔ اس عادت سے چھوٹی چیزیں محروم ذکر ہو کر محروم عن المطالعہ ہو جاتی ہیں۔ یہ تاریخ کا

ذاتی نقصان ہوتا ہے۔ مگر یہ شانِ پروردگارِ عالم کی کتاب کو میسر آئی۔ کہ اس کی تاریخ میں ہدایتِ انسانیہ کے لیے چھوٹی بڑی چیزوں کو سامنے آنے کا موقع دیا گیا ہے۔

قرآنِ مجید نے تبشیر و تنذیر کی صورت میں جس طرح قدرتِ خداوندی پر بحث کی ہے اور جس طرزِ بیان سے وہ ماضی کے احوال پر بات کرتا ہے۔ وہ طرز اس قدر جاذبِ قلب و نظر ہے۔ کہ کوئی عقل اس کی تسخیرِ دعوت سے بچ نہیں سکتی۔ اسی واسطے اس صحیفۂ خداوندِ ذوالجلال کو قولِ فیصل کی حیثیت میسر آتی ہے۔

سارا قرآنِ مجید تاریخ کا ترجمہ اعمال پر مرتب کرتا ہے۔ اور اس کا منشا ایسے اعمال کی ادائیگی ہے۔ جو ہمہ وجوہ احسن ہوں۔ اور اِن اعمال کا حُسن انسانیت پر اس طرح چھا جائے کہ اُس کی روشنی میں انسانیت کی قباحتیں واضح ہو کر سامنے آجائیں عالمِ تمثال میں جس طرح سورج کی شعاعیں جسم کے سائے کو الگ کر دیتی ہیں۔ اسی طرح احسن اعمال کی تابناکی انسانی گناہوں کو سائے کی طرح الگ کر کے انسانیت سے ان کو الگ کر دیتی ہے۔

چنانچہ قرآنِ مجید نے اپنی ازلی تاریخ ہونیکی گواہی اپنے رسولؐ کے سامنے اس طرح دی۔

" نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَٰذَا الْقُرْآنَ "

"یعنی ہم نے اس الہامی کتاب کے ذریعے تجھ پر نیک لوگوں کے یعنی انبیائے کرام کے تاریخی واقعات بیان کیے ہیں"۔ اس آیت میں "نَقُصُّ" اور "قَصَصَ" کے ساتھ قرآنِ مجید کی ازلی ابدی اور تاریخی حیثیت سامنے آجاتی ہے۔ اور تاریخ کا صحیح ترجمہ واضح ہو جاتا ہے۔ کہ انسانوں کے اعلیٰ کارناموں کے ساتھ ہی اعلیٰ تاریخ بن سکتی ہے۔

قرآنِ مجید نے تاریخ مرتب کرنے کے لئے انسانوں کو اعلیٰ کارناموں کے

ادا کر نیکی تعلیم دیتے ہوئے اجمالی تجویز پیش کر دی۔ قرآنِ مجید اعمال کا انتخاب کرتا ہے۔ تاریخ کا بیان کرنا اور ساتھ ساتھ اعلیٰ اعمال کا انتخاب کرنا تاریخ کے نصب العین میں داخل ہے۔ جو تاریخ انسانی احوال، اقوال، اعمال بیان کرتی ہے۔ اس کا منشائے وحید آنیوالی کونسلِ انسانیہ ان اعمال پر چلنے کی دعوت دینا ہوتا ہے۔

قرآنِ مجید نے تاریخ علمی کا ترجمہ سُنت اللہ، سُنتِ انبیاؑ و مرسلین اور سُنتِ صالحین کے ساتھ کیا ہے۔ تاکہ تاریخی نظریات کا مطالعہ کرنے والے تاریخی احوال کو اپنے جسم و جان پر منطبق کر سکیں۔ اور صحیح راہ پر آ سکیں۔ اس ضمن میں اس نے عملِ خداوندی کا انعامات کے طور پر ذکر کیا۔ عقلِ انسانی کو اور صفاتِ انسانیت کو نعمتِ خداوندی پر محمول کیا۔ اور فرمایا کہ تم اِن تاریخی انعامات کو اللہ کی دین سمجھتے ہوئے اللہ کے احکام کی تعمیل کر کے نیک بنو۔ اور نیکی کی راہ کھولو ہر بدی کو عملِ صالح سے ہٹاؤ اور لوگوں کو اعمالِ شنیعہ سے بچاؤ۔ تاکہ انسانیت بھلائی حاصل کرتی ہوئی، برائی سے بچتی ہوئی، مجموعی طور پر نیکیوں پر انسانی تاریخ مرتب کر سکے۔

اس روشنی میں قرآنِ مجید بندے کو حمد و ذکرِ باری تعالےٰ سے اذکارِ انبیاؑ و اولیاؒ سے تاریخی باب کے ابتدا کر نیکی تلقین کرتا ہے۔ تاریخ کی یہ وہ فطری صراط ہے۔ جس کا انتہائی سرا خدا کی رحمتوں سے جنت الفردوس کی راحتوں سے ملا ہوا ہے۔ اتنی واضح، پر معانی خزائن سے بھری ہوئی، رحمتوں اور دونوں جہانوں کی راحتوں سے مالا مال کرتی دوسری راہ نہیں ہو سکتی۔ خدا کے لازوال کردار نے اپنے فضل و کرم سے جن فطری خطوط پر چلنے کی دعوت دی وہ اس کا اپنا فضل ہے۔ جو انسان کو تاریخی کردار سے مالا مال کرتا ہے۔

قرآنِ مجید نے انبیاؑ کے ذکر کو "احسن القصص" فرمایا ہے۔ یعنی بہترین اعمال کا ذکر آدم علیہ السلام سے لیکر خاتم النبیین محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک "احسن القصص" کو درجہ بدرجہ تاریخی نوعیت پر چلاتے ہوئے تکمیل بخشی یہ تاریخ اُس دن مکمل ہوئی۔ جس دن فرمایا گیا۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ط یہ قرآنِ مجید کی آخری آیت ہے۔ جس میں ذکر فرمایا کہ میں نے آج کے دن آپ کے دین کو مکمل کر دیا۔ اور اپنی نعمت کو آپؐ پر پورا کر دیا۔ اور میں آپؐ کے دینِ اسلام سے راضی ہوا۔"

اس آیت میں تکمیلِ دین، اتمامِ نعمت، اور رضا بالاسلام کے ساتھ تین باتوں کو پیش کیا گیا۔ دین تاریخی حیثیت سے آئینِ فطرت ہے۔ جو انسانیت کے لیئے آخری ضابطۂ حیات ہے۔ ظاہر ہے کہ آئین اسی کو کہتے ہیں۔ جو تقسیم عمل کرے۔ اور اس کے اعمال کی سطح مرتفع فلاحِ دارین ہو۔ اور اعمال سب کے سب حصولِ انعام کیلئے ہوتے ہیں۔ بلا عمل حصولِ انعام رحمتِ الٰہی کے بغیر بالکل محال ہے۔ اس واسطے کہ بلا عمل حصولِ انعام کی عادت ڈالنا فطرت کے قاعدہ کے خلاف ہے۔ جو تن آسانی کی راہ کھولتا ہے۔

ہمیشہ یہی دستور مجلسِ انسانیہ میں نافذ العمل رہا۔ کہ انعامات تحریصِ اعمال کیلئے اور اعمال حصولِ انعام کیلئے ہی کارفرما رہے۔ اسی عادتِ انسانیہ کیمطابق اللہ تعالےٰ نے انعامات کو احسن القصص سے وابستہ کیا اور اسی ترکیب و ترتیب سے انعامات کی تحریص دی۔ جس طرح دنیا کے بادشاہ اپنے خیالات کے مطابق رعیت کو انعامات کے ساتھ تحریص دیتے ہیں۔ اور یہی تحریص ریاستوں میں ابنائے وطن کو حکمرانوں کے مجوزہ اعمال پر چلنے کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔

پروردگارِ عالم نے قرآنِ مجید میں مُنْعَمْ مِنَ اللّٰہ لوگوں کا ذکر ان کی تاریخی، نیکیوں کے ساتھ کیا ہے۔ اُن کے برجستہ عزائم، اور برجستہ فیصلوں کو منزلِ مقصود تک پہنچنے میں جن سختیوں کا سامنا کرنا پڑا اور جن کے جھیلنے کے بعد ان کو امامت ملی۔ ان سب کا ان کے اعمال کے ضمن میں ذکر فرمایا۔ تاکہ ان کی تاریخ کا کوئی حصہ انسانی نظر سے پوشیدہ نہ رہے۔ اور انسانیت صداقت کے میدان میں تسلیم کرلے کہ حصولِ انعام کیلئے اعمالِ صالحہ کا اختیار کرنا اشد ضروریات سے ہے۔

آدم علیہ السلام کی جملہ سختیوں کا ذکر کرتے ہوئے اُنہیں طلب حق میں سچا ثابت کیا۔ اور امامتِ ارضی کا حقدار گردانا۔ اسی طرح قرآنِ مجید نے انبیاءؑ کا تاریخی ذکر چھیڑتے ہوئے وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ کے طور پر تمام انبیاءؑ کا تاریخی ذکر اس جمیل اسلوب کے ساتھ کیا، کہ ہر دل ان اعمال کی ادائیگی کے لئے دیوانہ وار آگے بڑھے۔ ذکرِ جمیل میدانِ عمل کی طرف رکنز دیتا ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دینِ الٰہی کی وقتاً فوقتاً ترتیب وار ضرورتِ حال کے مطابق بکمال بجاآوری کی۔ دین مضمون کے طور پر مکمل تھا۔ مگر نزول کے اعتبار سے حالات کے مطابق احکام نافذ کرتا رہا۔ تاکہ انسان تدریجاً اس پر عمل پیرا ہو کر اس کے نافذ کردہ اعمال کا متحمل ہو سکے۔ اسی تدریجی احکام کے مطابق حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے اور آپؐ کے پیروکاروں نے دین کے اعمال کی تعمیلاً تکمیل فرمائی۔

دین مضموناً مکمل تھا۔ مگر عملاً حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے سیرتِ طیبہ کے ساتھ مکمل ہوا۔ تب تکمیلِ دین کی بشارت ہوئی۔ اس پر عمل پیرا ہونے کی

بنا پر مسلمانوں کو روحانی اور مادی تقویت کے ساتھ جو غلبہ میسر آیا اور دین و دنیا کی نعمتیں میسر آئیں۔ ان کے عوض میں انہیں دونوں جہانوں کے انعامات کے ساتھ خوشخبری سُنائی گئی۔ یہ سارے انعامات تعمیلِ حُکم کا درجۂ کمال حاصل ہونے پر عطا فرمائے گئے۔

ان انعامات کا ذریعہ دینِ اسلام تھا۔ اس کے ظاہر ہونے کے بعد عمل اسلام کیساتھ اسلام کو جو عزت میسر ہوئی۔ اس سے خدا کی خوشنودی کا اظہار ہوا۔ صاحبِ آئین، آئین کو دستورالعمل کی صورت میں اُس کے مطابق رُو بہ عمل ہونے کیلئے لاتا ہے جب اس پر عمل ہو جائے۔ تو آئین کی عزت و حُرمت قائم ہو جاتی ہے۔ اور یہی بقائے دستور کا ذریعہ ہوتا ہے۔ ورنہ لوگوں کی نظر میں آئین کی تکریم ختم ہو جاتی ہے۔ اور راہِ عمل مُنہدم ہو کر مفقود ہو جاتی ہے۔

آئین کی عملی تکمیل پر ہی صاحبِ ایمان راضی ہو سکتا ہے۔ بصورت دیگر آئین اور صاحبِ آئین کی سخت توہین و تضحیک ہوتی ہے۔ اگر اللہ تعالےٰ کے تازہ آئین کو عملی طور پر جامۂ تکمیل نہ پہنایا جاتا تو تکمیلِ دین، اتمامِ نعمت اور رضا بہ اسلام کی آخری بشارت نہ مل سکتی اور تاریخ کا ایسی حالت میں مرتب ہونا لاحاصل ہوتا۔ نااہل لوگوں کی تاریخیں اُن کی نااہلیت پر محمول ہوتی ہیں۔ لکھی جائیں یا نہ لکھی جائیں وہ بدنامِ زمانہ ہوتے ہیں۔ اور دُنیا اُن سے اُن کے کردار سے امان مانگتی ہے ایسے لوگوں کے واقعات پر جو نااہل تھے۔ اور میدانِ عمل میں نااہلی کا ثبوت دیا۔ اُن کو سخت سزائیں دی گئیں۔ اور مختلف عذابوں میں اُن کو پکڑا گیا۔

تاریخ قرآنِ مجید اُن کے ہولناک انجام کا بانگ دُہل اعلان کرتی ہے اور فرماتی ہے فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ "اے آنکھ والو! اُن کے ہولناک انجام سے عبرت حاصل کرو۔ ورنہ تمہارا انجام بھی ویسے ہی ہوگا"۔ اور اعمالِ صالحہ پر۔

لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَۃِ فرمایا۔

"یعنی اُن کیلئے دُنیا اور آخرت میں فلاح کی بشارت دیتا ہے۔ تاریخ قرآنِ مجید بار بار جو نصب العین پیش کرتی ہے۔ اُس کو مرکزی نقطۂ نظر بناتی ہے۔ اور اُس تک پہنچنے کیلئے قصد اوّلی کی تعلیم دیکر رختِ سفر کے تمام آداب بتاتی ہے۔ اِن منازل کے عقبات پر روشنی ڈالتی ہے۔ تمام منازلِ مقصود کی ہولناکیاں بیان کرنیکے بعد چلنے کی دعوت دیتی ہے۔ تاکہ چلنے والے کا دِل دجگر منزل کے مطابق مضبوط ہو جائے۔ وہ مضبوط دِل و جگر کے ساتھ منزلِ حق پر چلنے کا حکم سُناتی ہے اور مایوس و کمزور، بے حوصلہ، نا عاقبت اندیش لوگوں کو وعید سُناتی ہے۔

اس تاریخی وعید کا منشا تساہل اور تکاسل کو دُور کرنا ہوتا ہے۔ تاکہ وہ اہلِ عمل کے ساتھ ہو جائیں۔ اور زندگی کو میدانِ عمل میں مردُود العمل ہونے سے بچائیں۔ قرآنِ مجید نے راہِ عمل میں مردُود ہونے پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ ان تماثیل و نذارت و بشارت کے پیشِ نظر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین نے ایک دوسرے پر سبقت لینے کیلئے وہ فوق الادراک قربانیاں دیں۔ جن کا خیال کرنے سے بھی دِل لرز اٹھتا ہے۔ اپنے بچوں جیسی نعمت کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لئے ہر ایک نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ایثار کا ثبوت دیا۔

یہ قرآنِ مجید کے تاریخی نقوش تھے۔ جنہوں نے عدالتِ اسلامیہ میں عادلِ وقت کے بچوں کو قرآنِ مجید کے فیصلوں کے مطابق سزا کے لئے پیش کیا۔

قرآنِ مجید جہاں نیکیوں اور بدیوں کے درمیان تمیز کرنیکی اور انصاف کرنیکی تعلیم دیتا ہے۔ وہاں خلیفۃ المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالےٰ عنہ، کو اپنے لختِ جگر، نورِ نظر ابو شحمہ کو ایک جرم کی پاداش میں سرِ عدالت پکڑ لانے کی

ہدایت کرتا ہے۔

ماضی کے خدائی فیصلے انبیاءؑ نے پیش کئے تھے۔ جو طویل الذکر ہیں۔ قرآن مجید کے تاریخی قصص نے صحابہؓ پر عمل رسولؐ سے ان کو واضح کیا تھا۔

ان تاریخی عملی وضاحتوں کے پیشِ نظر عشاقِ رسولِؐ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کیونکر عمل پیرا نہ ہوتے۔ کیونکہ ان کا مزاج ہی راہِ حق پر ڈھل کر سراسر ایثار و اخلاص بن چکا تھا۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالےٰ عنہ؛ کو عدالت میں جب یہ معلوم ہوا کہ اُن کے بچے سے خلاف اسلام بے حیائی کا گناہ سرزد ہوا ہے تو آپ نے قرآن مجید کے فیصلوں کے مطابق اقدام کیا۔ جس پر ابراہیم علیہ السلام کے اس ذبحِ عظیم کا واقعہ بھی موجود ہے۔ کہ حکمِ الٰہی پر اپنے اکلوتے بیٹے کو جو دُنیا میں آپ کی محبت کا متاعِ اوّل و آخر تھا۔ خُدا کے سامنے پیش کر دیا تھا

اس قدر صبر آزما واقعات اہلِ اطاعت کو بڑی سے بڑی قربانی دینے پر تیار رہنے میں معاونت کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآنِ مجید کے تاریخی حقائق کے پیشِ نظر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ؛ بلا تامل اپنے گھر کی جانب تیزی سے چل پڑے.... اور گھر کے دروازے پر پہنچ کر دستک دیتے ہیں۔ یہ دستک بظاہر خلیفۃ المومنین کی تھی مگر بباطن خدا اور اُس کے آئین کی دستک تھی۔ خدا کے تربیت یافتہ دِل و جگر کی دستک تھی۔

جلالت مآب، بندۂ ربّ، خلیفۃ المومنین کی لرزہ خیز آواز دستک کے ساتھ بلند ہوئی۔ ابوشحمہ کہاں ہے؟ اندر سے آواز آئی، کہ وہ کھانا تناول فرما رہے ہیں۔ دوسری جلالت مآب آواز نے طعام سے دست کشی کیلئے فرزندِ محبوب کو مجبور کر دیا۔ فرزند جانتا تھا۔ کہ پدر کی یہ آواز فیصلہ کُن ہے۔ کوئی بات ہے کہ جس کی عدالت ہو رہی ہے۔ دروازہ کھُلا۔ خلیفۃ المومنین گھر میں

تشریف لائے۔ سخت غیظ و غضب کی حالت تھی۔ دہشت سے در و دیوار کپکپا اُٹھے۔ فرمایا ابو شحمہ! تیری زندگی کا یہ آخری لقمہ ہے۔ میں تجھ کو عدالتِ خداوندی میں لے جانا چاہتا ہوں۔ تیار ہو جاؤ۔ تم ایک سخت جُرم کی پاداش میں مدعا علیہ ہو۔ اور تمہارا مُدعی فیصلۂ حق سُننے کیلئے عدالت میں منتظر ہے۔

یہ فرمایا اور اپنے ہاتھ کی انگلیوں کے ساتھ ابو شحمہ رضی اللہ تعالٰے عنہ کی زلفوں کو گرہ دے لی۔ اور شدت کے ساتھ ان کو عدالت کی طرف گھسیٹنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ درِ عدالت پر پدر معہ اپنے پسر کے حاضر ہو گیا۔

ابو شحمہ کی مدعیہ ایک عورت تھی۔ جس کے ہاتھوں میں ایک بچہ تھا۔ اسی بچے کو عدالتِ عالیہ میں پیش کر کے اس نے مقدمہ دائر کیا تھا۔ کہ یہ بچہ ابو شحمہ کا ہے۔ چنانچہ خلیفۃ المومنینؓ نے اس عورت کے سامنے بلا تحقیق و تدقیق فوراً اپنے بیٹے سے استفسار چاہا۔ ابو شحمہ! کیا تم اس عورت کو پہچانتے ہو۔ کہا ہاں پہچانتا ہوں۔ پوچھا۔ کیا تم نے اس کے ساتھ بے حیائی کا جرم کیا ہے؟ کہا ہاں۔ پوچھا۔ یہ جُرم قرآنِ مجید کے نزدیک حُدود اللہ کو پھاندنے کے برابر ہے۔ قرآن مجید اس جُرم کیلئے سخت سزا مقرر کرتا ہے۔ باوجود اس حکمِ امتناعی کے تم نے حُدود اللہ کو کیوں توڑا؟ کیا تم خوفِ الٰہی، خوفِ آخرت بھُول گئے تھے؟ پسر نے جواب دیا۔ ابّا جان! یہ گناہ حالتِ سُکر میں مجھ سے سرزد ہوا ہے۔ کیوں کہ مجھ کو شراب پلا دی گئی تھی۔

اس مقام پر قرآنِ مجید کے تاریخی فیصلے سامنے آ گئے۔ سُکر کی حد قرآنِ مجید میں یہ بیان کی گئی ہے۔ کہ جب انسان اپنی کہی ہوئی بات کو نہ سمجھ سکے۔ اس قرآنی فیصلہ کے پیشِ نظر خلیفۃ المومنینؓ نے پوچھا۔ کہ بیٹا! شراب کی حالت میں تم اس درجہ مخمور تھے۔ کہ تمہیں اپنے عمل کی خبر نہ تھی؟ یا تم کو اپنے گناہ کا علم

تھا؟ جواب دیا کہ میں حالت سُکر میں تھا۔ مگر میرا سُکر اس درجہ پر تھا کہ مجھے اپنے گناہ کا علم تھا۔

آپ نے فرمایا۔ میرے بیٹے اس حالت میں تم پر دو گناہ عائد ہوتے ہیں شراب کا پینا اپنی جگہ ایک گناہ ہے۔ اور وہ کبائر سے ہے۔ اور بے حیائی اپنی جگہ ایک گناہ ہے۔ اور وہ بھی کبائر سے ہے۔ دونوں گناہ حُدود اللہ کو توڑنے کے مترادف ہے۔ چونکہ اس عورت کے پاس بچہّ ہے۔ اس واسطے سب سے پہلے تمہیں بے حیائی کے گناہ کی سزا دی جاتی ہے۔ قرآنِ مجید کے فیصلے کے مطابق بے حیائی کا گناہ کرنے والے مرد اور عورت دونوں مستوجب سزا ہوتے ہیں دونوں کو یکساں طور پر سو سو دُرّے مارنے کا حکم ہے۔ مگر حکمِ قرآن کے بموجب اسلامی فیصلے میں بچےّ والی عورت کو بچےّ کی تکفیل کیلئے مدّتُ العمر کا تعین کیا گیا ہے۔ بچےّ کی اس مدت تک ماں کی سزا ملتوی کی جاتی ہے۔ چنانچہ عورت کو بچےّ کی کفالت کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ اور عادلِ وقت نے قرآنِ مجید کے اس تاریخی فیصلہ کے مطابق اپنے آفتاب و مہتاب کو شرمانے والے پسر کے بارے میں حُکم صادر فرمایا کہ اسے سو دُرّے لگائے جائیں۔ تمام اکابر اور حاضرین نے فریاد کی کہ یا امیرالمومنین! ابو شحمہ کو معاف کر دیا جائے اسکی جگہ ہماری جانیں لے لی جائیں۔ ہمارے بچےّ لے لئے جائیں۔ مگر ابو شحمہ کو کوئی آنچ نہ آئے۔

ابو شحمہ رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ کی ایک صِفت معروفِ عام تھی۔ کہ جب وہ قرآنِ مجید پڑھتے تھے۔ تو آپ کی آواز اور طرزِ قرأت حضور علیہ الصّلوٰۃ والسلام کی آواز کے مشابہ ہوتی تھی۔ جس پر لوگ مفتون ہو جاتے تھے۔ اس صِفت کو بھی پیش کیا گیا۔ مگر عادلِ وقت نے جواب دیا کہ قرآنِ مجید حق دارِ سزا کے

بغیر دوسرے کو سزا نہیں دیتا۔ اور اس کے نزدیک چھوٹے اور بڑے انسان کے گناہ کا کوئی امتیاز نہیں۔ قرآنِ مجید اپنے فیصلے میں کوئی امتیازی سلوک نہیں کرتا۔ اس واسطے کہ وہ عملی میدان میں فطری اصول پر نتائج مرتب کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کل خدا کے حضور میں، میں نے اپنا اور اپنے بچے کا حساب پیش کرنا ہے۔ اُس وقت مجھے کوئی شخص کام نہیں آئے گا۔ میں اللہ کے سامنے شرمسار نہیں ہونا چاہتا۔ اس کے بعد اپنے بچے کو نصیحت فرمائی کہ بیٹا! دُنیا دارِ فانی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ادائیگی تعزیر کے بغیر میدانِ حشر میں خلیفۃ المومنین کے بیٹے ہو کر ایسے شرمناک مجرموں کے زُمرہ سے اُٹھائے جاؤ۔

ادائیگی تعزیر، دنیا میں بظاہر ایک سخت سزا ہے۔ مگر اس کے ادا ہونے کے بعد مجرم اسی دنیا میں پاک ہو جاتے ہیں۔ اس واسطے میرے محبوب بیٹے! میں تجھے اللہ کی مقرر کردہ سزا کا یعنی سو درے لگانے کا حکم دیتا ہوں۔ جس میں اللہ کے نزدیک میری اور تیری دونوں کی عافیت ہے۔ تمہیں اللہ کے اس حکم کی بجاآوری کیلئے دل وجان سے تیار ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ابوشحمہ کو پوری پاکیزگی غسل کے ساتھ تیار کیا گیا۔ جلادوں کو بلا کر عادلِ وقت نے ان الفاظ میں حکم سنایا

اے جلادو! "سو درے مارنے کا حکمِ خداوندی ہے۔ یہ میرا حکم نہیں ہے۔ میں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی طرف سے قرآنِ مجید کے فیصلوں پر مامور ہوں اگر دُرے مارنے میں ذرا بھی تامل کرو گے تو میں تمہیں سزا دوں گا۔ اور میدانِ حشر میں تمہیں پکڑ دوں گا۔ قرآنِ مجید کے فیصلے کے مطابق تمہیں تخفیف کی قطعاً اجازت نہیں۔ لہذا پورے زور سے ابوشحمہ کے بدن پر دُروں کی پیہم ضربیں لگاؤ

اللہ تعالےٰ کے اس حکمِ مقدس کے نفاذ کے بعد تعمیل کی صُورت یوں سامنے آتی ہے۔ کہ پدر نے اپنے پسر کو سزا کے لئے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھا۔

چنانچہ حضرت ابوشحمہ کے بدن کو برہنہ کر دیا گیا۔ عزیز ترین متاعِ قلب و جگر، نورِ نظر کا بہ سماں دِل میں خدا کا خوف رکھنے والے پدرِ عادِل کے سامنے ہے۔ وہ چاہے تو اپنے حُکم سے اپنے بچّے کو چھوڑ دینے کا قطعی مجاز ہے مگر تعمیلِ حکمِ خداوندی میں مطلق العنان آمریّت کا جزواً بھی ثبوت نہیں مِلتا اس واسطے کہ اسلام میں ہر عادل محکومِ خدا ہے۔ جس کو اصطلاحِ قرآن میں مامُور و محکومِ خدا کا نام دیا جاتا ہے۔ اور آمر مطلق العنان ہوتا ہے۔ وہ اپنے اُوپر کسی دوسری طاقت کو مُسلط نہیں دیکھنا چاہتا۔ لہذا اس کے سب فیصلے خود پسندانہ ہوتے ہیں۔

قرآنی حکومت میں حاکمِ وقت پر اللہ کی حکومت اور رعیّت دونوں کا دباؤ ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے فیصلے رعیّت کو اللہ کا بندۂ محکوم ہونیکی حیثیت میں سُناتا ہے۔ اور اپنے لئے اور رعیّت کے لئے کوئی امتیاز نہیں کرتا جس پر جمہوریتِ اسلام کا صحیح اطلاق ہوتا ہے۔ آپ نے اسی خداوندی جمہوری عدالت کے سامنے پسرِ محبوب کیلئے فیصلہ کیا۔ اور خوفِ الٰہی کی بنا پر سامنے کھڑے ہو کر اپنے بیٹے کو دُرّے لگوائے کہ کہیں جلّاد دُرّے مارنے میں تخفیف نہ برتیں۔ چنانچہ دُرّوں کی آواز آنی شروع ہو گئی۔ دُرّوں کی ضربوں سے بدن پر انجمادِ خون ہوتا ہے۔ جس سے بہ شدّت پیاس اٹھتی ہے۔ چند دُرّوں کے بعد ابوشحمہ کو شدّت کی پیاس محسوس ہوئی۔ تو آپ نے ابّا جان کی طرف اُمید بھری نظریں اٹھا کر پکارا۔ العطش، العطش، العطش! ابّا جان مجھے پیاس ہے۔ ابّا جان مجھے پیاس ہے۔ ابّا جان مجھے پیاس ہے۔ ابّا جان نے جواب دیا۔ میرے پیارے بیٹے! حوضِ کوثر تمہارے قریب ہے۔ تم تعمیلِ خداوندی کی بجا آوری میں پیاس محسوس کرتے ہو۔ چند لمحوں کے بعد بہ تعمیلِ

حُکم تمہیں حوضِ کوثر سے ہمکنار کر دے گی۔ یہاں میں نہیں چاہتا۔ کہ تکمیلِ سزا سے پہلے تم پانی پیئو۔ اسی ہیئت مجموعی میں ۸۰ دُرّوں کی نوبت پہنچی کر آپ کے جسد عنصری سے رُوح پرواز کر گئی۔

اللہ تعالےٰ کے عادلوں کو کتنا خوف ہوتا ہے۔ خشیتِ ربّانی کس قدر غالب ہوتی ہے۔ کہ سب کچھ ہوتے ہوئے اپنے آپکو اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کے سامنے بے بس قرار دیتے ہیں۔

یہی عبودیت کا سچّا مقام ہوتا ہے۔ بعد میں ۲۰ دُرّے نصابِ شرعیہ کے مطابق باقی تھے۔ آپ نے بعد از تدفین بیٹے کی قبر پر ان بیس ۲۰ دُرّوں کا باقی ماندہ حساب اپنے ہاتھوں سے پُورا فرمایا۔ اور بیس ۲۰ دُرّے ابو شحمہ کی لحد پر مار کر قرآن کا نصابِ سزا مکمل کر دیا۔

یہ تاریخِ قرآن کا عملی ورق ہے۔ جس کی موجودگی میں خلافتِ اسلامیہ پر آمریت کا الزام نہیں لگ سکتا۔ ایسا الزام لگانا سراسر حق سے چشم پوشی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ یہ خبر ریاست کے اندر اور باہر غیر ممالکِ اسلامیہ تک پہنچ گئی۔ اور عدالتِ ربّانی کا انسانیت کے سامنے اس طرح ترجمہ فرمایا۔ کہ دُنیا قرآنِ مجید کے فیصلوں پر انگشت بدنداں ہو کر عش عش کر اُٹھی۔ بھلا جس قوم کا عادل محکوم خدا ہو کر قرآنِ مجید کے فیصلے اس طرح علی الاعلان کر رہا ہو۔ اور اپنے بچوّں کو بھی پکڑ کر عدالت میں لاتا ہو اور کسی کو بھی نہ چھوڑتا ہو جس پر جیسا فیصلہ اطلاق کرے اُس کے مطابق فیصلہ جاری کرتا ہو۔ اُس قوم میں کون ہے جو گناہ کی جسارت کر سکے؟ کون باپ ہے اور کون بیٹا ہے؟ اس رعیّت کی کون سی ایسی ماں اور کونسی ایسی بیٹی ہو گی؟ اور کونسا ایسا لاڈلا ہو گا؟ جو قرآنِ مجید کے تاریخی فیصلوں سے بچ سکے؟

مجرمین کا کیا سوال ؟ ایسی دنیائے عدل میں جرائم کو بھی ذبح کر دیا جاتا ہے۔ جس عادل کا آئین قرآن اور حاکم خدا ہو اور اُس کے رسولؐ حاکم ہوں۔ جو اپنی بیٹی فاطمہؓ کو کسی دوسری فاطمہ کی سزا کے موقع پر اس طرح زجر کر رہا ہو تُو تو فاطمہ بنت عبداللہ ہے اگر فاطمہ بنت محمدؐ رسول ہوتی تو اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیئے جاتے۔ ایسی حکومت الٰہیہ کی سرزمینوں میں گناہ ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتا۔

حضرت علیؓ شیر خدا کی زرّہ چوری ہو جاتی ہے۔ پانچ سال بعد ایک غیر مسلم قبطی کے ہاتھوں فروخت کرتے ہوتے پکڑی جاتی ہے۔ حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہٗ ایک مدعی کی حیثیت سے قضاۃ خانۂ اسلام میں دعویٰ دائر کرتے ہیں۔ قبطی مُدعا علیہ ہونے کی حیثیت سے عدالتِ اسلام میں حاضر ہوتا ہے۔ مدعی اور مدعا علیہ اسلامی عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہیں۔ کہ اسی اثنا میں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ بیٹھ جاتے ہیں۔ قاضی القضاۃ کے سامنے قرآنِ مجید کھلا ہے آواز آتی ہے "خلیفۃ المومنین آپ خلیفۃ المومنین کی حیثیت سے اپنے مدعا علیہ کے سامنے کھڑے ہو جائیں۔ آپ کا مدعا علیہ کھڑا ہے۔ اس واسطے آپ بیٹھ نہیں سکتے۔ قرآنِ مجید مساوات کا حکم دیتا ہے۔ یہ حکمِ خداوندی سُن کر بغیر کسی رنج و ملال کے آپ کھڑے ہو گئے۔ قُضاۃ خانے سے قاضی وقت کی دوسری آواز بلند ہوئی کہ خلیفۃ المومنین! آپ نصابِ شہادت پورا فرمائیں یعنی اپنی زرہ کے صحیح دو گواہ پیش کریں۔ کہ واقعی یہ زرہ آپ کی ہے۔ باوجود جاننے کے کہ یہ زرہ میری ہے۔ حضرت علیؓ شیر خدا گھر تشریف لائے۔ اور نصابِ شہادت پورا کرنے میں کسی صنعتِ عقلی سے کام نہیں لیا۔ بلکہ خوفِ ربانی گواہ تلاش کرنیکے وقت بھی آپکے دل میں موجود تھا۔

آپ نے اپنے اہل کاروں کو بلایا۔ اور اُن سے اپنی زِرّہ کا کوئی نشان نہ بیان کرتے ہوئے پوچھا کہ فلاں وقت میری زِرّہ چوری ہو گئی تھی۔ اس کے نشانات تمہیں یاد ہیں کہ نہیں۔ اس طریقۂ استفسار سے صرف ایک گواہ ملا مگر پھر بھی آپ نے اپنی زِرّہ کے نشانات نہ بتائے۔ اور ایک ہی گواہ لیکر عدالتِ خداوندی میں حاضر ہوئے۔ ایک گواہ عدالت میں پیش کیا۔ فوراً فیصلہ صادر ہوا۔ کہ اے خلیفۃ المومنین! قرآنِ مجید کے نزدیک آپ نصابِ شہادت پورا نہیں کر سکے۔ اس لئے آپ کے مقدمے کا فیصلہ قبطی کے حق میں کیا جاتا ہے۔ اور قبطی بری کر دیا گیا۔

آپ نے اس فیصلہ کو سُننے کے بعد اسے بخوشی قبول کر لیا۔ اور دوبارہ اپیل کرنا حق کے نامناسب جانا۔ قبطی نے اس فیصلہ خداوندی کے بعد حقّانیتِ خداوندی کے اسلامی فیصلوں کے ساتھ اس قدر اثر لیا کہ اسی وقت اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ ۝ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔

قرآنِ مجید کی تاریخی عملی حیثیت مسلمانوں پر جس طرح مرتّب ہوئی۔ وہ ایک طرف اپنی صداقت کا ختمی اور زندہ ثبوت ہے۔ جس نے مساوات کے میدان میں گورے وکالے، عربی، عجمی، شاہ و گدا، عوام و خواص سب کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا۔ اور عزور کے اُونچے سے اُونچے سر کو خدا کے سامنے جھکا دیا۔ اس عملی تاریخ میں قرآن کی تاریخ کائنات کی تواریخ پر برتری لے لیتی ہے۔ اور دوسری جانب مسلمانوں کو آزادیٔ حق کے ساتھ علیٰ منہاجِ فطرت حسین ترین اعمال کے ساتھ عملی تاریخ مرتّب کرنے کا موقع دیتی ہے۔ تاکہ ابنائے آدمؑ سچی تاریخ کے تعینات کو اپنا کر صداقت کی راہوں پر آ جائیں۔

کربلا میں دُودمانِ رسالت کا خاتمہ قرآنِ مجید کی تاریخی حیثیات پر ایثار و شہادت کا مرقع بن کر سامنے آیا اور کائنات کی عزیز ترین ہستیاں سر بانزار شہید ہو گئیں۔ قرآنِ مجید نے کربلا کے میدان میں جس تاریخ کی بنیاد ڈالی۔ اس کا نمونہ نہ کوئی پیش کر سکا اور نہ کبھی پیش کر سکے گا۔ اس قسم کے بہت سے واقعات صدیقوں، شہیدوں، صالحین نے قرآنِ مجید کے پیش کردہ احکام کی تعمیل میں اس طرح مرتب فرمائے کہ ارض و سما کی ہر چیز اُن کی صداقت ماننے پر مجبور ہو گئی۔

قرآنِ مجید ایسی تاریخ ہے جو انسانوں کو فطرت کے عوامل پر کار بند ہونے کی تعلیم دیتی ہے۔ کہ جس کو رُوحِ انسانی تسلیم کرنے کے بغیر نہیں رہ سکتی۔

قرآنِ مجید نے خدا کی حقانیت کے ساتھ انسانیت کو عدل و انصاف، حُسن مُروّت و مساوات اور سچائیوں کی راہ دکھائی ہے۔ جس پر چل کر ساری دُنیا نجات پا سکتی ہے۔

قرآن مجید اور آدابِ زندگی

کسی عالمِ دین یا عارفِ باللہ کا ایکدوسرے
سے مل جانا محض اللہ کا فضل ہوتا ہے دونوں کو
ایکدوسرے سے بندگی کے آداب سیکھنے چاہئیں عالم
کو عارف سے عاجزی کا درس لینا چاہیئے اور عارف
کو عالمِ دین سے احکاماتِ دین سیکھنے چاہئیں اس
قسم کا ادب سیکھنے کیلئے توسّل جائز ہے لیکن بے ادب
اور بے دین کا توسّل جائز نہیں ہے اگر کسی ولی اللہ کا
دامن اسلئے پکڑا جائے کہ احکامِ خداوندی کی بجاآوری
کے بغیر نجات ہوسکے گی اور یہ کہ وہ ولی اللہ ترس کھاکر
بخشوادیگا تو اس قسم کے باطل خیالات سراسر دینِ الٰہی سے
بغاوت اور سراسر گمراہی کے مترادف ہونگے اسلام ایسے
خیالاتِ باطلہ کی شدت سے تردید کرتا ہے۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ط وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝

یہ دُنیا سرائے فانی ہے اور اس سرائے فانی میں جو لوگ بھی اللہ کے فضل سے تشریف لائے وہ سب کے سب محتاج تھے اور جو اب موجود ہیں اور جو لوگ آئیں گے وہ سب محتاج ہوں گے۔

خالقِ فطرت نے اپنی منشأ کے مطابق ذی جان مخلوقات پر احتیاج کو مسلّط کر دیا ہے اور اس احتیاج کا منشأ یہ تھا کہ اللہ کے سوا کوئی بھی معبود ہونیکا دعویٰ نہ کر سکے اور کسی طرح بھی معبُود نہ بن سکے اس پر اللہ تعالےٰ کی ذات و صفات کی منشا بہت نہ ہو سکے اللہ تعالےٰ سب جہانوں کا بادشاہ ہے سارے جہان اسکی ملکیت ہیں سارے جہانوں کے مکین اس کے مملوک ہیں۔

اللہ احکم الحاکمین ہے اس نے اپنی مرضی سے کائنات کو پیدا کیا اپنی مرضی سے زندگانیاں عطا کیں اور اپنی مرضی سے صورتیں اور سیرتیں تخلیق فرمائیں عقلوں کو حیران کر دینے والا یہ سارا تماشائے عالمین اسی کا بپا کیا ہوا ہے۔

مندرجہ بالا آیات میں ان محتاجوں۔ غرض مندوں اور ہر قسم کی احتیاج رکھنے والوں کو استعانت کا صحیح طریقہ سکھایا اور مومنین سے خطاب فرمایا گیا ہے۔ "اے فطری تعلیمات کے حامل مسلمانو! تم اس بات کو سمجھ سکتے ہو کہ انسان سراسر محتاج ہے جو کسی طرح بھی معبود ہونیکا حق نہیں رکھتا۔ سب انسان ایک دوسرے کے محتاج ہیں اس واسطے تمہیں یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ تم ایک دوسرے کی احتیاج دُور کرو اور لوگوں کو یہ تعلیم دو کہ سب کچھ اللہ ہی دیتا ہے۔ اور سب اسی کے

محتاج ہیں۔ لہذا سب مل کر اُسی سے استعانت طلب کریں۔ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ میں سب مومنوں کو اللہ سے استعانت حاصل کرنیکا حکم دیا گیا ہے کہ اے ایمان والو صبر و استقامت اور نماز کے ساتھ اللہ سے مدد مانگو۔ کیونکہ دنیا دارالآلام دارالآشوب۔ دارالمحن اور دارالاغمام ہے۔ یہاں پریشانی اور غم آزمائش کے طور پر دیئے جاتے ہیں اور بیماریاں بھی آزمائش کیلئے بھیجی جاتی ہیں۔

انسانیت ہر دور میں مبتلائے آلام رہی ہے اور رہے گی۔ اگر کوئی انسان اسی دنیا میں رہ کر چاہے کہ غم سے نجات پائے اور اس سے بے تعلق رہے تو یہ ممکن نہیں ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ نوزائیدہ بچہ اسی دنیا میں آکر سب سے پہلے روتا ہے اس کی سب سے پہلی صدا اس کا غم ہے وہ غم و آلام سے دوچار کر دیا جاتا ہے اگرچہ اس کی بصیرت نارسا ہوتی ہے۔ فہم نارسا ہوتا ہے لیکن اس کی فطرت صاحب رسا ہوتی ہے اور احساس دلاتی ہے کہ دنیا دارالاغمام اور دارالآلام ہے وہی اس کو رُلاتی ہے اس کی فطرت اس بات کا احساس رکھتی ہے کہ جس مقام پر اسے ڈال دیا گیا ہے اس کی ساری مسافت زیست میں غم والم بکھیر دیئے گئے ہیں۔

قربان جائیں تعلیماتِ مصطفائی ﷺ پر کہ وہ سب کی سب عینِ فطرت ہیں دُنیا مومنوں کیلئے گھر نہیں بلکہ قید خانہ ہے اور منکرینِ حق کیلئے جنت ہے دُنیوی تعلیمات کی رُو سے یا نفسانی تعلیمات کی رُو سے نہیں بلکہ شریعت اور آخری نبیؐ پاک صلی اللہ علیہ وسلّم کی ختمی تعلیمات کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ یہ دنیا دارِ فانی ہے اس کو دارالفراق قرار دیا گیا ہے جہاں کوئی شخص ہمیشہ قیام نہیں کر سکتا یہ قید خانہ ہے یہاں طرح طرح کی پابندیاں ہیں یہ ایسا دام تزویر ہے جہاں محبت بھی ہوتی ہے فراق بھی ہوتا ہے یہاں کوئی شخص اپنی محبت کو بالکل پورا نہیں کر سکتا۔

دُنیا میں سب سے بڑا مقام بادشاہی کو سمجھا جاتا ہے شہزادوں اور شہزادیوں کو بڑے ناز و نعم سے پالا جاتا ہے قصرِ شاہی میں آرام و آسائش کی ہر چیز جو رُوئے زمین پر میسر آسکتی ہے مہیا کی جاتی ہے ان کے عشرت کدے اور آئینہ خانے نوادراتِ عالم سے سجائے جاتے ہیں جہاں جلالِ شاہی تمکنت آرا ہوتا ہے اور جمال شاہی آرام کرتا ہے وہاں پہرے لگائے جاتے ہیں اور ان کی ہر طرح حفاظت کی جاتی ہے وہاں غربت کا گزر تک نہیں ہوتا وہاں کی زندگی مصائب سے ناآشنا ہوتی ہے لیکن جب کبھی وہاں موت آتی ہے تو اس کو شاہی پہرے دار نہیں روک سکتے سارے جہاں کا دبدبہ اور سطوت شہزادوں اور شہزادیوں کو موت سے نہیں بچا سکتے ساری زندگی کا جمع شدہ مال و متاع اور ازوقہ زیست موجود ہے لیکن مسرت کدے ماتم کدے بنے ہوئے ہیں اور خوشیوں کی جگہ غموں نے لے لی ہے جب موت آتی ہے تو خوشیوں کو یکمشت لوٹ لیتی ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ ہم دارالاغمام۔ دارالآلام اور دارالفراق کے مسافر ہیں جہاں باپ اور بیٹے میں پیار ہوتا ہے لیکن خدا تعالےٰ کا قانون ان کے درمیان بھی فراق ڈالتا ہے ماں اور بیٹی میں بہت محبت ہوتی ہے لیکن انہیں بھی جُدا کر دیا جاتا ہے میاں اور بیوی ہمدمِ زندگی ہوتے ہیں لیکن موت کے ساتھ وہ بھی الگ کر دیئے جاتے ہیں۔

قانونِ قدرت کی بہت سی کیفیات تمہاری آنکھوں سے اوجھل اور مستور ہیں تم خداداد بچوں خداداد امارت اور علم و ہنر سے اور زمان و مکان سے کھیلتے ہو لیکن تمہیں اس کی کوئی خبر نہیں ہوتی کہ ایک لمحے بعد کیا ہونے والا ہے زمین و آسمان میں کیا کچھ ہو گا۔ لیکن اسلامی تعلیمات نے تم کو باخبر کر دیا ہے کہ تم کچھ بھی نہیں ہو تمہاری یہ زندگی فانی ہے اور تمہارے یہ کھیل اُدھورے ہیں اس لئے

فرمایا کہ دنیا مسلمانوں کا گھر نہیں ہے یہ تعلیم کس قدر عالم ہست و بود کے مزاج اور وجودِ خاکی کی فانی فطرت کے عین مطابق ہے تمام علوم اور مابعد الطبیعات کا خلاصہ یہ ہے۔

اللہ تعالےٰ اُن مومنوں سے جو اُس پر ایمان لائے اس کو وحدہٗ لاشریک تصوّر کیا اپنے آپ کو محتاج جانا اُس کو غنی کہا اپنے آپ کو بندہ اور اس کو احکم الحاکمین مانا۔ خطاب فرماتا ہے کہ تم صبر کے ساتھ اور نماز کے ساتھ استعانت طلب کرو اے دارالمحن کے مسافرو! تم استقامت اور صبر کے ساتھ کام لو اللہ تمہاری مدد کریگا اگر تم استعانت چاہتے ہو اور رضائے الٰہی کے طلبگار ہو تو سب سے پہلے تمہاری نیّت میں استقامت کا ہونا ضروری ہے اگر تمہاری نیّت میں تذبذب ہوگا تو اپنی مراد تک نہ پہنچ سکو گے تم اللہ سے امداد طلب کر رہے ہو اگر تم پر کسی قسم کا غم یا مصیبت ہے۔ تم بیمار ہو یا کوئی احتیاج رکھتے ہو تو اللہ کو اللہ سمجھتے ہوئے اس کے حضور میں حاضر ہو جاؤ۔ اپنی نیّت کو مستقل کرو تمہارے پاس ایمان موجود ہے اس پر استقامت حاصل کرو۔

اگر تمہارے اُوپر کسی قسم کا خارجی، نفسیاتی یا عقلی دباؤ ہے تو اس کو ختم کر دو کیونکہ خارجی دباؤ کبھی تمہارے لئے نفع بخش ثابت نہیں ہو سکتا اللہ کے سوا کوئی داخلی یا خارجی قوت تمہاری مدد نہیں کر سکتی اس لئے جتنے قسم کے دباؤ تمہاری طبیعت پر ہیں ان کو دُور کرو اور صبر کے ساتھ برداشت کرتے ہوئے اللہ کے حضور میں حاضر ہو جاؤ یہاں تک تو صبر کا ذکر ہے اس کے بعد نماز کا ذکر آتا ہے۔

نماز اللہ تعالےٰ پر ایمان لانے کے بعد خالص نیّت کے ساتھ شروع ہوتی ہے بدن اور لباس کی پاکیزگی اور ارکان سے متعلق ہو کر نماز، نماز بنتی ہے یہ اظہارِ عبودیت ہے اور گردشِ لیل و نہار کے پانچ اہم اوقات میں نیّت سے اس کی ابتدا ہوتی

ہے جس آدمی کی نیت متزلزل ہو وہ مکمل وضو نہیں کر سکتا اس کی نماز درست نہیں ہو سکتی اس واسطے فرمایا کہ پہلے تم صبر کو اپناؤ۔ پھر نیت میں استقلال پیدا کرو اور نماز قائم کرو اور اسے پورے ارکان کے ساتھ ادا کرو اس کے بعد خدائے لم یزل کے حضور میں صبر و استقامت کے ساتھ استعانت طلب کرو۔

ایسا صبر۔ ایسی استقامت اور ایسی نماز بے حد دشوار ہوتی ہے اِلَّا عَلَی الْخَاشِعِیْن مگر خاشعین پر دشوار نہیں ہوتی یہاں خاشعین کو تذبذب اور تزلزل سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے یعنی سوائے اہلِ خشیت کے دوسرے لوگ ایسا نہیں کر سکتے ان کیلئے یہ حالت بہت گراں ہے ہمہ وقت اللہ سے ڈرنے والے اور اس سے اُمید رکھنے والے ہی ایسا کر سکتے ہیں۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب کسی کو کوئی تکلیف پہنچے یا غربت مسلّط ہو جائے یا کوئی بیماری آگھیرے تو وہ اللہ کے حضور فریاد کرتے ہیں لیکن جُوں جُوں دولت مند ہوتے جاتے ہیں یا مصائب سے چھٹکارا پاتے ہیں اللہ کو فراموش کر دیتے ہیں حالانکہ اللہ کی نظر میں غربت اور امارت یکساں ہیں عنداللہ ساری کائنات غریب ہے جو انسان حادثات کا شکار ہو سکتے ہوں اور گر کر لوٹ سکتے ہوں۔ پانی میں بہہ سکتے ہوں۔ آگ میں جل سکتے ہوں اور موت کا شکار ہونے والے ہوں سب عاجز ہیں۔

اہل ایمان خاشعین۔ راحت اور غم دونوں میں نماز پڑھ سکتے ہیں اس واسطے کہ وہ صاحبِ صبر اور صاحبِ استقامت ہیں۔ وہ ارکان الصلوٰۃ سے باخبر ہوتے ہیں اور وہ ہمہ وقت اللہ تعالےٰ کے حضور میں ظاہر و باطن سے حاضر رہتے ہیں۔

خاشعین کون ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے دلوں میں اللہ تعالےٰ کا خوف

رکھتے ہیں وہ ریاکار یا فریبی نہیں ہوتے وہ شعائر اللہ کے سخت پابند ہوتے ہیں وہ ایمان والے لوگ ہیں جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کا بھی یقین رکھتے ہیں کہ ان کو خدا کے رُو برُو پیش ہونا ہے اور حساب دینا ہے۔

یاد رکھو انسان کو اللہ کی طرف رجوع کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے یقیناً سب کو اللہ کی طرف رجوع کرنا ہے جو اسے تسلیم کرتے ہیں وہ بھی اور جو نہیں کرتے وہ بھی اسی کی طرف رجوع کریں گے ظالم و مظلوم۔ گنہگار و بیگناہ سب اس کے حضور میں حاضر ہونگے اور انبیاءؑ و اولیاءؒ اور شاہ و گدا سب حاضر کر دیئے جائیں گے اور انصاف کے دن اللہ کے سوا کوئی بادشاہ نہیں ہوگا اور اس دن کامل اختیارات کا مالک صرف اللہ ہوگا چنانچہ اللہ نے ساری ذی جان مخلوق کے لئے فرمایا۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۞ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۞

"ان سب کو جو ذی جان مخلوق ہیں موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور اللہ کی طرف رجوع کرنا ہے۔"

استعانت بالصّبر والصّلوٰۃ کی تفسیر کی ضمن میں فرمایا اے استقلال رکھنے والو اور مصائب پر صبر کرنیوالو اور اللہ کے حضور میں نماز پڑھنے والو۔ اگر اگر تم بھی اللہ سے استعانت چاہتے ہو تو اپنی نیتوں کو پاک و صاف کرو اور ایمان پر استقامت حاصل کر کے صبر سے کام لیتے ہوئے خوشی و غم میں اظہارِ عبودیت کرتے ہوئے اپنے مالک و مولا کے سامنے نماز کے ساتھ حاضر ہو جاؤ وہ تمہاری ضرور مدد کریگا۔

نیّت کی مثال بیج کی مانند ہے اگر بیج صحت مند ہو تو اس کا درخت اور اثمار سب صحت مند ہوں گے کسی مومن کی نیّت ٹھیک ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ

احکامِ الٰہی پر عمل پیرا نہ ہو جب وہ امر و نہی پر صحت نیت کے ساتھ پابند ہو گا تو اس کے اعمالِ زندگی بھی صحت مند ہوں گے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور اس کے رسولؐ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز کا شوق رکھتے ہیں پھر بھی ہم سے نماز نہیں پڑھی جاتی۔ آج یہ روش عام ہو گئی ہے میں نے اکثر نوجوانوں کو یہ کہتے ہوتے سُنا ہے کہ اللہ اور رسولؐ، قرآنِ مجید اور یومِ آخرت پر ہمارا ایمان ہے اور اسلام سے ہمیں محبت ہے لیکن ہم سے نماز نہیں پڑھی جاتی۔

یہ کیسا ایمان اور کیسی محبت ہے جو اپنے نتائجِ ایمان کو برآمد نہیں کر سکتی کھیت سے محبت رکھنے والا دہقان اگر کڑکتی دھوپ میں محبت کا مظاہرہ کر سکتا ہے تو خدا سے محبت رکھنے والا کیونکر نماز سے جُدا ہو سکتا ہے دہقان کو جب معلوم ہوتا ہے کہ زمین فصل پیدا کر سکتی ہے اور اس سے منافع میسر آ سکتا ہے تو شدت کی گرمی اور سردی میں لگاتار محنت کرتا ہے اس کو یقین کامل ہوتا ہے کہ نتیجے میں اسے فصل میسر آئیگی بازاروں میں جا کر دیکھئے تاجر صبح و شام دولت کی نماز پڑھتے ہیں یعنی وقت پر حاضری اور لگاتار محنت اس بات کی دلیل ہے کہ وہ دولت کو عزیز رکھتے ہیں اور ایک لمحے کیلئے اس سے غفلت پسند نہیں کرتے جب لوگوں کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ فلاں مقام پر نفع ہے تو سب وہاں پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اور سب کے سب اپنی جُملہ صلاحیتوں کے ساتھ وہاں حاضر ہو جاتے ہیں یہاں تک سب نوجوان و ضعیف عورتیں۔ مرد خاص و عام تلاش منافع میں مصروف نظر آتے ہیں اور یہ سب طالبانِ دُنیا خشوع اور خضوع کے ساتھ حصولِ زر کے ارکان کو پوری طرح بجا لاتے ہیں اور اس میں دیدہ و دانستہ کوئی فرو گذاشت نہیں کرتے کہ مبادا نقصان ہو جائے۔ بکثرتِ اہلِ دُنیا قطار در

قطار در قطار۔ فوج در فوج۔ قافلہ در قافلہ دولت کی طرف دوڑ رہے ہیں کیونکہ ان کو یقین ہے کہ دولت سے نفسانی خواہشات پوری ہوتی ہیں اور اس پر وہ استقامت بھی حاصل کر لیتے ہیں۔

جو لوگ اللہ تعالےٰ اور اس کے رسولؐ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ اوامر و نواہی ان ہی کے مفاد کیلئے ہیں تو پھر ان سے نماز کیوں نہیں پڑھی جاتی معلوم ہوا ایمان تو ہے لیکن مستحکم ایمان نہیں ہے نیت تو ہے مگر متزلزل خوف و رجا تو ہے مگر ناقص کلام الہٰی سے ان کے قلوب صحیح معنوں میں متاثر نہیں ہیں۔ ان کو اللہ۔ رسولؐ اور اسلام سے ویسی محبت نہیں جس کے وہ مدعی ہیں۔

اگر وہ اپنے دعوؤں میں سچے ہوتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ نماز نہ پڑھتے اور روزہ نہ رکھتے۔ زکوٰۃ نہ دیتے اور حج نہ کرتے اور یتیموں کی خبر گیری نہ کرتے پڑوسیوں کا حق ادا نہ کرتے اور کوئی وجہ نہ تھی کہ ان کے اندر خدا ترسی نہ ہوتی دنیا میں کسی کی بیوی بیوہ ہو سکتی ہے۔ کسی کے بچے یتیم ہو سکتے ہیں۔ کسی پر غربت مسلّط ہو سکتی ہے تو کیا یہ تصوّر نہیں کیا جا سکتا کہ سب کی بیویاں بیوہ ہو سکتی ہیں سب کے بچے یتیم ہو سکتے ہیں اور غربت و افلاس سب پر مسلّط ہو سکتا ہے یہ کیسی خُدا ترسی ہے کہ بعض لوگوں کے پالتو جانوروں کو اعلیٰ ترین اور صحت بخش غذائیں ملیں اور غریب پڑوسی کا بچہ کسمپرسی کے عالم میں بلک بلک کر مر جائے پڑوس کا مریض بچہ دوا سے بھی محروم ہو بے کسوں اور ناداروں کو طرح طرح کے امراض چمٹیں اور غربت کی وبائیں نازل ہوں ان کی مائیں آنسو بہانا چاہیں مگر بہا نہ سکیں یعنی شدتِ آلام سے ان کی آنکھوں کے سوتے خشک ہو جائیں۔

مائیں سب کی یکساں ہوتی ہیں جس طرح ایک بے کس بچے کی ماں رو سکتی

ہے۔ اسی طرح ایک شہزادے کی ماں بھی رو سکتی ہے ایک غریب بچے کا باپ کیا کچھ تمنائیں نہیں رکھتا کون سا ایسا باپ ہے جو اپنے آل و اولاد کو خوشحال نہیں دیکھنا چاہتا اگر کسی کے دل میں یہ تصوّر اور حیثیت پیدا ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کو خالص عبادت اور معاملات کے ساتھ راضی نہ کرے۔

اس دارالمحن میں انسان خوشی کی تلاش میں سراب کی چمک سے دھوکہ کھاتا ہے چند مجازی چیزیں اس کے ہاتھ میں آجاتی ہیں تو وہ ان سے بہل جاتا ہے لیکن خوشی پھر بھی اسے میسّر نہیں آتی طمانیت قلب و نظر سے وہ پھر بھی دُور رہتا ہے کیونکہ وہ حقیقت سے دُور رہتا ہے اس کی فریب خوردگی کا یہ عالم ہے کہ وہ کہیں سے یہ سُن پائے کہ دنیا کے کسی حصّہ میں کسی نے کوئی چیز ایجاد کرلی ہے تو حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے لیکن وہ نہیں سوچتا کہ گردشِ لیل و نہار کا ایسا تحیّر خیز عمل اسکی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے اس کی بنیاد کس حقیقت پر ہے نظامِ تخلیق کی ابتدا کیونکر ہوئی۔ تکوینِ کائنات کا مقصد کیا ہے مسلمانوں پر یہ ضروری ہے کہ ایسے بنیادی مسائل پر غور و فکر کریں۔

آتش و آب اور باد و خاک نظامِ تخلیق کے بنیادی عناصر ہیں انسان ان میں سے کسی ایک کا بھی خالق نہ بن سکا اور نہ موت پر قابو پا سکا ہماری آنکھوں کے سامنے شب و روز میں تغیّرات ہو رہے ہیں اور بنیادی مسائل پر زندگانیوں کو باقاعدہ فرد عات میں تبدیل کیا جا رہا ہے زندگانیاں واپس لی جاتی ہیں اور نئی زندگانیاں روزانہ تفویض ہو رہی ہیں لیکن کوئی ان محیّر العقول کارناموں سے متحیّر نہیں ہوتا۔ تحیّر انگیز حالات تو پہلے ہی موجود ہیں جو دعوتِ حق دیتے ہیں لیکن تم انسانی تخلیقات پر متحیّر ہوتے ہو اور خالق کائنات کی تخلیق پر تعجب نہیں کرتے یہ کوتاہ بینی۔ سوءِ الادبی اور آدابِ زندگی کے منافی ہے۔

دراصل تمہاری نیت کو بہت سی خارجی قوتوں نے لوٹ لیا ہے کہیں دولت کہیں طاقت، کہیں عارضی حسن اور کہیں ادھورے علم نے لوٹا ہے۔ اکثر لوگ مجاز کا شکار ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ یقینی بات ہے کہ لوگوں میں نیکی کی صلاحیت موجود ہے اُسے ایمان کے سوزِ دروں سے حرارت کی ضرورت ہے۔

جب ایمان پختہ ہو جائے گا اور اس میں استقامت پیدا ہو جائے گی تو سارے خارجی دباؤ ختم ہو جائیں گے اور یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ساری کی ساری مخلوق و کائنات اس کے اشاروں کا کرشمہ ہے اور اسی کے حسن کا پرتو ہے اور یہ اسی کے مظاہر ہیں وہ ہمارا معبودِ مطلق اور دستگیر ہے۔ دستگیر وحدہٗ لاشریک ہے ہم اس کی عبادت کرتے ہیں اور اسی سے پناہ مانگتے ہیں اور اسی سے استعانت کے طلبگار ہیں اور وہ مستعانِ حقیقی ہے دنیا کی کوئی طاقت۔ خواہ وہ لطیف ہو یا کثیف ہو۔ غیر مختار ہے مختارِ حقیقی خداوند ذوالجلال ہے لوگوں کو اسی کو مختار جاننا چاہیئے اسی کی عبادت کریں اسی کے حضور میں حاضر ہو کر فریاد کریں جب وہ راضی ہو جائے گا تو خود بخود اسباب پیدا ہو جائیں گے۔ لوگوں میں سے ہی لوگوں میں عالم و فاضل۔ ولی۔ حاکم عام و خاص بھیج کر تائید فرمائے گا۔ یہ اللہ کی مہربانیاں ہیں کوئی انہیں سچے دل سے تلاش کرتا ہے تو مل جاتی ہیں قانونِ قدرت کے تحت اسباب پیدا ہوتے ہیں جن سے کام نکل آتے ہیں لیکن اسباب اور مسبب الاسباب میں تمیز پیدا کرنا ضروری ہے اگر کوئی عالمِ دین یا ولی اللہ مل جائے تو یہ محض اللہ کا فضل ہے اس سے بندگی کے آداب سیکھنے چاہئیں۔ ادب سیکھنے کے لئے توسل جائز ہے لیکن بے ادب اور بے دین ہونے کیلئے نہیں۔

اگر کسی ولی اللہ کا دامن اس لئے پکڑا جائے کہ احکامِ خداوندی کی بجا آوری کے بغیر بھی وہ بخشوا دے گا تو یہ سراسر غلط ہے شریعت میں اسکی شدت

سے ممانعت کی گئی ہے۔

اہل اللہ کے پاس اس واسطے جانا چاہیئے کہ بندگی کے آداب حاصل کئے جائیں بھیجنے والے نے ولی اللہ کو منافع بنا کر بھیج دیا ہے جس طرح ایک درخت ثمر کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے حالانکہ وہ مختار نہیں ہے کسی طاقت نے اسے ثمر لوگوں کے کھانے کیلئے عطا فرمائے ہیں جن سے استفادہ ثواب ہے اور اس سے انکار کفرانِ نعمت ہے کوئی ثمر دار درخت مل جائے تو اس کے پھل ادب سے کھانے چاہئیں مگر درخت کی پرستش نہ کی جائے۔

ماں باپ پرورش کیلئے اسباب ہیں معبود نہیں۔ عالم دین۔ ولیٔ وقت اور حکمرانِ وقت معبود نہیں بلکہ اسباب ہیں۔ وَابْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ نے جو نعمتیں پیدا کی ہیں ان سے استفادہ کرو۔ نیکیوں سے اور نیک بندوں سے استفادہ کر کے اللہ کی طرف رجوع کرو نعمتیں اس واسطے ہیں کہ ان سے استفادہ کرنے کے بعد روحانی اور جسمانی قوت حاصل ہو اور وسیلہ پکڑنے والے اللہ تعالٰے کی بے ریا عبادت اور مخلوقات کی بے لوث خدمات سرانجام دے سکیں اللہ تعالٰے نے روحانی اور مادی وسائل اس واسطے بنائے ہیں کہ ان سے جائز اور حلال طور پر استفادہ کر کے انسانیت کی خدمت کی جائے یہ ایک طریقۂ تشکر ہے اسطرح علمائے دین اور اولیائے کرام اہل جہاں کیلئے ایک سایۂ عاطفت ہیں انہیں کچھ توفیقات دی گئی ہیں اور یہ ہر انسان کو بالعموم اور مومن کو بالخصوص دی جاتی ہیں جو ان کا کسب نہیں بلکہ اللہ کا فضل ہے۔

اولیاء اللہ اس کے معترف ہیں کہ یہ تفویضاتِ الٰہیہ ہیں اور اللہ نے جو کچھ دیا ہے اس سے اِنتفاع چاہتے ہیں ان کے سائے میں بیٹھ کر روحانی قوت اور بصیرت حاصل کی جائے اور اللہ کی طرف رجوع کیا جائے۔ بستم رسیدوں

دردمندوں، یتیموں، دریدہ حال غریبوں اور بیواؤں کی سرپرستی اور خدمت سے اللہ کی رضا جوئی کو حاصل کیا جائے رفتہ رفتہ قلب طمانیت حاصل کرتا جائے گا نیت اور ایمان میں استقامت آجائے گی اور زندگی کے آداب سے آشنائی حاصل ہوتی جائے گی۔

قرآنِ مجید اور عبادت

قرآنِ مجید کی جملہ تعلیمات انسانی طبیعت کو عبادت
کی طرف مائل کرتی ہیں تاکہ وہ خدا کے معبود ہونیکا
سچا اقرار کرتے ہوئے اپنی عبودیت کا پوری
تعمیل کے ساتھ اظہار کرے۔ اسکے علاوہ قرآنِ مجید
یہ ثابت کرتا ہے کہ قدرت کے سارے عوامل صرف
انسان کیلئے ہیں۔ اور یہ عوامل قدرتی طور پر اپنے
مفروضوں پر تعبیلاً کاربند ہیں۔ اور انسان ان
جملہ عوامل فطریہ کا محورِ کبریٰ ہے۔ نظامِ کائنات
کے منظوم عوامل گوشۂ عقلِ انسانیہ کو پوری ترتیب
کے ساتھ مائل بہ عبادت دیکھنا چاہتے ہیں اللہ
کی فطری ہدایت سے انسان اتنی بلندی پر فائز ہو
جاتا ہے کہ وہ صرف اور صرف اللہ تعالےٰ کا اطاعت
گزار بندہ ہو جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم عبادت کے لئے معبودِ برحق کا انتخاب کرتا ہے۔ اور اس کی صفات کا اس طرح تعین کرتا ہے۔ کہ وہ کسی دوسرے میں نہ پائی جائیں اور ان صفاتِ عالیہ کا استحقاق صرف معبودِ برحق کے لئے ہو۔ اس معبودِ برحق کے لئے مختلف مقامات پر مختلف حالات کے پیشِ نظر طبع انسانی کے اُتار چڑھاؤ کے مطابق مختلف انداز سے ذکر فرماتا ہے۔ اور ان حیثیاتِ ذاتیہ وصفاتیہ کے بیان کا تفصیل سے ذکر کرنا عابد کے عقیدۂ توحید کو پختہ کرنے اور حق پر ایمان کے لئے غیر متزلزل کرنے کیلئے ہوتا ہے۔ تاکہ وہ اپنے معبود کے ایمان پر اور اس کے احکام کی تعمیل میں کسی کام پر لغزیدہ نہ ہونے پائے۔ چنانچہ وہ اُس کی الوہیت کا اس طرح ذکر فرماتا ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ۝

"یعنی اللہ وہ ذات ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ غائب وشہود کو جاننے والا ہے اور وہ رحمان ورحیم ہے۔"

اس آیت میں اُلوہیت کا تعین علمِ غائب اور علمِ شہود کو مِنْ حَیْثُ الْمَجْمُوعِ صفتِ علمیہ۔ ذاتیہ کے ساتھ اور رحمانیت۔ رحیمیت کی صفاتِ ذاتیہ کے ساتھ کیا گیا ہے اللہ تعالےٰ کی یہ تینوں صفات ذاتی طور پر صرف اسی کیلئے مخصوص ہیں۔ رحمان کی صفت ایسی ہے جس کے متعلق علمائے محققین نے فرمایا ہے کہ اس صفت کا اللہ کے سوا کسی اور پر اطلاق نہیں ہوسکتا اور فرمایا لَا یُطْلَقُ عَلٰی غَیْرِہٖ کہ اس صفت کا اطلاق کسی دوسرے پر ہو ہی نہیں

سکتا۔ اس کے علاوہ :۔

"اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط

"یعنی اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے حیّ و قیوم ہے نہ وہ سوتا ہے نہ اونگھتا ہے۔ زمینوں اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسی کا ہے۔ پھر فرمایا :۔

تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ، الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط

"یعنی برکتوں والی وہی ذات ہے جس کے قبضۂ قدرت میں سارے جہانوں کی بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے جس نے موت و زیست کو پیدا کیا تاکہ تمہارا امتحان کر سکے کہ تم میں سے کون اچھے اعمال والا ہے"۔

اس قسم کی بہت سی آیات قرآنِ مجید میں الوہیت کا تعیّن اسم اللہ اور اُس کی صفات کے ساتھ کرتی ہیں۔ خدا کی کرشمہ سازیوں کو محض اس واسطے تکرار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے کہ ذہنِ انسانی پر اللہ کی ذات معہ اپنی صفات کے مثبتِ حقیقی کی صورت میں ثبت ہو جائے۔ اس تصوّر کے ذہن نشین کرنیکا منشاء پورے جذباتِ باطن کے ساتھ ایمان لاکر اللہ کی عبادت کرتا ہے عبادت کے لُغوی معنی۔ "بندگی" کے آتے ہیں۔ بندگی اس چاکری کا نام ہے جو اپنے مالک کی مرہونِ منّت ہو کر اُس کے احکام کی بجا آوری میں اپنے اعمال کا صدقِ دل سے مظاہرہ کرے۔ جن کی ادائیگی کے ساتھ اس کے مالک کی رضا ہو۔ اور مرضیاتِ مالک کے چھوٹے چھوٹے احکام سے لیکر سخت سے سخت ترین احکام کی پابندی کرنے سے گریز نہ کرے۔ جزءً اور کُلاً مالک کے احکام کی پابندیؔ کا نام بندگی ہے۔ اس کے تعیّنات سے ہر مُو فرق لانا بندگی کے منافی ہے عبادت بظاہر ایک

چھوٹا سا لفظ ہے جو پانچ حروف پر ترتیب دیا گیا ہے مگر معانی اور تاثیرات کے اعتبار سے اتنا جامع ہے کہ دُنیا کی ہر چیز اس کی ادائیگی حق کے سامنے ہیچ ہو جاتی ہے۔ قانونِ فطرت میں اللہ تعالےٰ نے ہر چیز کو اس کی نوعیت کے مطابق کچھ کام سپرد کیا ہے۔ اس تقسیم عمل میں "ذوی العقول" اور "غیر ذوی العقول"۔ ذی جان اور غیر ذی جان ساری مخلوق شریک ہے۔

خُدا کی ہر مخلوق اپنے مقسومہ اعمال کی انجام دہی میں اپنی آفرینش سے لے کر آج تک مصروفِ عمل ہے۔ بہائم اور وحوش ذی جان مخلوق میں چیونٹی سے لیکر سیمرغ تک اور جملہ بہائم اور وحوش وطیور تک۔ بحری اور برّی ذی جانوں تک۔ ذرّے سے لیکر آفتاب و مہتاب تک کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اپنے فرائض سے ایک لمحے کیلئے بھی غفلت کر رہی ہو ذرّوں سے جُم میں چھوٹی دنیا منفیہ ہے۔ منفیوں کا مفروضہ عند الحکمت یہ ہے کہ وہ ذرّے کے گرد ہمہ وقت مصروفِ گردش ہوتے ہیں اور ان کی یہ گردش تعمیل حکمِ باری تعالےٰ سے واقع ہوتی ہے بعض عارفوں کے نزدیک بانوے ۹۲ منفیے ایک ذرّے کے گرد گردش کرتے ہیں۔ مگر سائنس کی دقیق حکمت نے ان کو متعدّد کہا ہے۔ بہر حال ایک ذرّے کے گرد متعدّد منفیوں کا گردش کرنا منفیوں کا فریضہ ثابت ہوتا ہے جب دو ذرّے قریب ہوتے ہیں تو ان کی دوئی کے ساتھ منفیوں کی تعداد بھی ثانیوں میں بدل جاتی ہے۔

اس طرح دس ذرّوں کے ساتھ ہزار منفیوں کی گردش ایک عظیم تحرک بپا کردینے کا باعث ہو جاتی ہے۔ یہ ذرّات و منفیوں کا باہمی ارتباط دنیا کی تعمیر میں ایک عجیب کردار ادا کرتا ہے جب یہ کروڑوں ذرّے ایک ٹیلے کی صُورت اختیار کر لیتے ہیں تو اس تحریک کے ثانیوں میں تبدیلی کا حیرت انگیز مطالعہ اہل فکر ہی کر سکتے ہیں۔ اسی ارتباط پر کائنات تعمیر ہوئی۔ یہ سنا لئے غیر ذی جان عوامل اللہ کے حُکم کی تعمیل میں

اپنے عمل کو جاری رکھتے ہیں۔

ایک ذرّے و منفیے کی تعمیلِ حکمِ الٰہی سے وہ معجز نمایاں رونما ہوتی ہیں جنکی تشریح کیلئے ابدالآباد تک کیلئے وقت ناکافی ہو جاتا ہے ایک چھوٹے سے پودے کی دنیا میں پانی کی نقل و حمل ان ہی ذرّوں اور منفیوں کی تحریک کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بظاہر ایک سو فٹ کا درخت جو سخت جان نظر آتا ہے اس کے ساتھ کوئی ایسی مشین متعلق نہیں ہے جو ساٹھ فٹ کی بلندی پر اس کی کونپلوں اور اس کے پھل پھول میں پانی تقسیم کر سکے مگر اس کی لہلہاتی ہوئی دُنیا کسی خاموش لشکر کی اپنے مفروضوں پر چلنے کی مرہونِ منّت ہوتی ہے۔

یہ ذرّوں کی تعمیلِ حُکم کا نتیجہ ہوتا ہے کہ نباتات تدریج سے حالت بلوغ حاصل کر کے ذی جان مخلوقات کو اپنے پھل پھول سے نوازتے ہیں اس تعمیل حکم کے نتیجہ میں ذی جان مخلوقات اپنا رزق مہیا کرتی ہیں کائنات کی وسعتیں اپنے دامن میں جتنی لاتعداد صفات سمیٹے ہوئے ہیں۔ یہ سب اسی تعمیلِ حکم کا نتیجہ ہیں۔ ان پر غور و خوض کرنے کے لئے اس واسطے بار بار انسان کو تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ قدرت کے ان عوامل پر سنجیدگی سے غور و فکر کر سکے۔ جن سے انسانی فکر کو تحیّر پیدا ہو اور خدا اور اس کی قدرت کے سامنے مبہوت ہو کر اپنی عاجزی کا اعتراف کر لے۔

قرآنِ مجید کی جُملہ تعلیمات انسانی طبیعت کو عبادت کی طرف مائل کرتی ہیں تاکہ وہ خدا کے معبُود ہونے کا سچّا اقرار کرتے ہوئے اپنی عبودیت کا پوری تعمیل کے ساتھ اظہار کرے۔ اس کے علاوہ قرآنِ مجید یہ ثابت کرتا ہے کہ قدرت کے سارے عوامل صرف انسان کے لئے ہیں۔ اپنے مفروضوں پر تعمیلاً کاربند ہیں اور انسان ان جُملہ عوامل فطرت کا محورِ مرکزی ہے۔ نظامِ کائنات کے منظوم عوامل گوشہ عقلِ انسانیہ کو پوری ترتیب کے ساتھ مائل بہ عبادت دیکھنا چاہتے ہیں۔ اللہ

کی اس فطری ہدایت سے انسان اتنی بلندی پر فائز ہو جاتا ہے کہ وہ صرف اللہ کا مخاطب ہو کر اس کی بندگی کرتا ہے۔ عبادت کا بنیادی مفہوم منفی سے مثبت کی طرف رجوع ہے۔ منفی اور مثبت کا تعلق ہر میدان میں اصنافِ کائنات کو اجسام کی صورت دیتا ہے اور حیات کی صورت میں زندگی دیتا ہے۔

مادی کائنات میں ہر مثبت شے کے ساتھ منفی کا ہونا مقصدِ تحریک کے نتیجہ خیز ظہور کیلئے ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح معبودِ حقیقی کے لئے ماسوا اللہ کے موجودات کو منفی کر دینے سے ثبوتِ حق کا دل پر ظہور ہوتا ہے۔ اور اس کا اقرار بزبان مومن :۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے تعلیمی اقرار کے ساتھ ہوتا ہے جو بظاہر اقرار اور بباطن تصدیقِ قلب سے رُونما ہو کر مکمل اقرار بنتا ہے جس سے عبادت کیلئے جذبۂ محبت پیدا ہوتا ہے۔

محبت ایک ایسا جہاں ہے جس کی نمائیں محبوب کے لئے منزلیں اختیار کرتی ہیں اور منازل کے جملہ رازہائے سربستہ کو معلوم کر کے حاصل کرنا محبت ہی کا حصہ ہے۔ محبت راز کے میدانوں کو تلاش کرتی ہے اور محبوب کا نیاز حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس ترتیب کے ساتھ عبادت سے پہلے محبتِ خداوندی کا میسر آنا عبادت کیلئے لازم ہے اس راہ میں محبت۔ راز و نیاز تینوں کی سالکِ راہ کو ضرورت پیش آتی ہے اور یہی تینوں چیزیں سختیٔ منزل کو سالک پر آسان کرتی ہیں اور سختیٔ منزل کو سالک اپنا زادِ راہ بناتا ہے اور جو سالک تلاشِ حق کیلئے ان چیزوں کو زادِ راہ بناتا ہے اس کو فاقہ۔ قناعت اور ریاضت جیسی کٹھن منزلوں کو عبور کرنا پڑتا ہے جن کو عشاقِ حقیقت کے گرد آلود چہروں نے اپنی مشقت سے ثابت کیا ہے۔

ہر منفی اپنے مثبت کے سامنے محکوم ہوتا ہے اور ہر مثبت اپنی صفاتِ

بلند و بالا کے ساتھ منفیوں پر مثبتانہ طور پر حاکم ہوتا ہے اور ان دونوں کی حیثیت اپنے اپنے مقام پر طالب و مطلوب کی ہوتی ہے۔ مطلوب کا ثبات ہی طالب کو وجدانی تحریک سے گردش دیتا ہے۔ اور یہی گردش مقصودی حیثیت میں معراج کمال کی طرف بڑھتی ہے۔ غیر ذی جان چیزیں اپنے مثبت و منفی میدانوں سے گزرتی ہوئی انسانی عقل کو دعوتِ حق دیتی ہیں کہ ہم صرف تیری خدمت کیلئے مامور ہیں مگر دعوتِ حق انسانی عقل کو اپنی طرف دعوت دیتی ہے کیونکہ عبادتِ الٰہی کا اختصاص بندے کو سونپا گیا ہے اور یہ بندے قرآنِ مجید کی زبان میں جن اور انسان ہیں۔ جن کو عبادات کے تکلفات میں ڈالا گیا اور عبادات کی تخصیص ان کے ساتھ فرمائی۔ ارشاد فرمایا:۔

مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ط

"ہم نے جنوں اور انسانوں کو سوائے عبادات کے اور کسی غرض کیلئے پیدا نہیں کیا ہے"۔

اس میں صرف دو گروہوں کو اس واسطے مخصوص فرمایا گیا کہ وہ صاحبِ عقل ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ نفس بھی ہیں۔ تکلفات کا لزوم نفسیات و خواہشات اور لذات کی موجودگی میں ہوتا ہے ورنہ وہ محض فعلِ خلقی ہو جاتے ہے۔ فعلِ خلقی اس مشین کی مانند ہے کہ جس کو جس کام کیلئے بنایا جائے بس وہی کچھ کرتی ہے تکلف کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ مگر اس کے مقابلے میں فعلِ امری ایک ایسا سلسلۂ عمل ہوتا ہے جس میں تکلف لازم ہوتا ہے۔ اس آیت میں فرشتوں کو اور دوسری مخلوقات کو شامل نہیں کیا گیا کہ یہ فعلِ خلقی کی حیثیت میں ہیں۔

فرشتے اگرچہ ذی عقل ہیں مگر نفسیات و خواہشات سے مبرا ہونے کی وجہ سے غیر متکلف ہیں۔ ان کو جس کام کیلئے پیدا کیا گیا ہے وہ ان سے بہرحال سرزد ہوتا

رہتا ہے۔ اور اس حالت میں انہیں اضداد اور اعلال سے مجاہدہ درپیش نہیں آتا لہذا حکمِ الٰہی کی تعمیل میں انہیں کوئی تکلف محسوس نہیں ہوتا۔ اور نہ ان کے سامنے گردشِ روزگار ہے نہ بھوک ہے نہ ننگ۔ نہ سفر و حضر کی صعوبتیں۔ نہ رنج والم۔ نہ اولاد نہ خاندان۔ نہ طلب معاش اور نہ حوادث۔ نہ فکر زلازل۔ نہ ہنگامۂ کائنات کی فکر۔ یہ تمام اضداد اور اعلال صرف جنوں اور انسانوں کیلئے ہیں۔

فرشتوں کے علاوہ تمام حیوانات جو مطلق حیوان ہیں وہ غیر ناطق اور غیر عاقل ہونیکی بنار پر غیر مکلّف قرار دیئے گئے اس واسطے احکام کی تعمیل کی صعوبتوں کا احساس نہیں کر سکتے۔ لہذا ان کو اور غیر ذی جان چیزوں کو فعل خلقی پر تعبیر کر کے غیر مکلّف قرار دیا اور جملہ صعوبتوں کو تعمیلِ حق کی بجا آوری کے لئے جبلتاً انسانوں اور جنوں کے لئے مخصوص کیا۔ تخلیقِ آدم بندگی کے لئے ہوئی اور بندگی کی تکمیل صعوبتوں کو عبور کرنے کے ساتھ رکھی گئی اسی واسطے فرشتوں کی تخلیق کے بعد بنی آدم کی تخلیق فرمائی گئی۔ بنی آدم سے پہلے جنات کو تخلیق فرمایا گیا مگر یہ مغلوب الغضب ہونیکی بنا پر مفضول کر دیئے گئے اور پیکرِ خاکی کو صورتِ آدمؑ میں مجموعۂ شفقت بنا کر فرشتوں۔ جنوں اور سب مخلوقات پر افضل قرار دے دیا اور تکمیلِ بندگی کا فریضہ اس کے سپرد کیا۔ اس تخلیق کا اعادہ بالارادت اس فرمان کیساتھ کیا اور فرمایا:۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ط

"یعنی جب تیرے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین پر ایک خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں تو فرشتوں نے اس خطابِ ربانی پر جواباً کہا کہ اے اللہ! تو اس کو خلیفۂ ارض بنانا چاہتا ہے جو زمین پر فساد کریگا اور خون ریزی کرے گا حالانکہ اس کے مقابلے میں ہم بلاجدل و قتال تیری تسبیح و تقدیس بیان کرتے ہیں۔"

فرشتوں نے یہ بات الہاماً کہی تھی۔ ورنہ بعد میں آنیوالی نسل آدمؑ کے متعلق انہیں قبل از تخلیق کیا خبر ہو سکتی تھی اس کے جواب میں پروردگارِ عالم نے فرمایا :۔

قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ "اے فرشتو۔ تمہاری تخلیق اور تخلیقِ آدمؑ کے بارے میں۔ میں زیادہ علم رکھتا ہوں جو تم نہیں رکھتے۔" چونکہ فرشتوں نے اپنا سوال اپنی استطاعتِ علمی پر کیا تھا۔ اس واسطے ان کی استطاعتِ علمی پر فضیلتِ علمیہ انسانیہ ثابت کرنے کے لئے وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ۝ فرما کر فضیلتِ علمیہ کا حقدار انسان کو ٹھہرایا۔

یعنی ہم نے آدم علیہ السلام کو جملہ علوم سکھا دیئے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ کوئی گوشۂ علم ان پر مخفی نہ رکھا گیا۔ اس تفویضِ علمیہ کے بعد قدرتی طور پر ایسے سوال کے۔ ایسے جواب کے بعد قطعی فیصلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ عادلِ حقیقی بندگی کے میدانوں میں فیصلہ بکمال کرنا چاہتے تھے تاکہ عدلِ خداوندی کا کوئی گوشہ سائلوں پر چھپا نہ رہے اور وہ میدانِ بندگی میں خدا کے انتخابی فیصلوں کو تسلیم کر لیں اور یہ تسلیم و رضا ہمیشہ کے لئے انسانوں کو میدانِ زندگی میں فضیلت دے۔ چنانچہ معترضانہ سوال کرنیوالے فرشتوں اور آدم علیہ السلام کو بعد از تخلیق متعارض کیا۔ اس تعارض میں فیصلۂ خداوندی آدمؑ کے حق میں ہوا۔ چنانچہ ارشاد ہوا۔

ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝

یعنی پھر فرشتوں اور آدم علیہ السلام کو امتحانی طور پر ایک دوسرے کے سامنے کر دیا۔ پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ آدمؑ کے مقابلے میں جملہ اسماءِ مسمّیات بیان کرو۔ اس امتحانی سوال پر فرشتے علمِ آدمؑ کے سامنے فیصلۂ ربانی پر مبہوت ہو کر ورطۂ حیرت میں گم ہو گئے اور سخت تعجب کی حالت میں بول اٹھے۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝

"یعنی پاک ہے تُو۔ تمام تسبیحات تیرے لائق ہیں۔ ہم کچھ نہیں جانتے۔ مگر صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تُو نے ہمیں تفویض فرمایا۔ چونکہ تو ہی جاننے والا حکیم ہے۔ تیرے علم و حکمت کے سامنے تیرے فیصلوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔"

یہاں نوعیتِ تخلیق کا تعارض خاکی اور نوری کے ساتھ ہوا۔ خاکی صاحبِ نفس فضیلتِ علمیہ کے ساتھ آراستہ ہو کر ان نوریوں کے سامنے آیا جو اس ایزادِ نفس سے محروم تھے اس سے ظاہر ہوا کہ فضیلتِ علمیہ اور فضیلتِ علمیہ کے میدانوں میں حصولِ بندگی کے لئے انسان کو صفِ اوّل اس واسطے دی گئی کہ اس کی خلقت تعمیلِ حکم کے لئے مکلف تھی۔ اس کے بعد کی آیات میں پروردگارِ عالم نے مکلف آدمؑ کو مسجودِ ملائیک ہونیکا موقع بخشا اور فرشتوں کو فرمایا کہ تم آدمؑ کے سامنے سجدۂ تعظیم بجا لاؤ۔ تمام فرشتوں نے اس حکم کی بلا کسی لیت و لعل کے بجا آوری کی۔ مگر شیطان نے اس مقام پر مغلوب الغضب اور مغلوب الحسد ہونیکی بنا پر نافرمانی کی۔ تکبر کیا اور بجا آوریٔ حکم الٰہی سے روگردانی کی اور کافر ہوا۔

عارفوں نے فرمایا کہ پروردگارِ عالم نے جہاں آدمؑ کو نفسانی اضداد کے مقابل پیدا کر کے بندگی کے لئے ادائیگی کا حکم دیا۔ وہاں شیطان کو اس کے نفس کے مقابل اضلال کی صورت میں پیدا فرمایا۔ یہ تکلف در تکلف کی صورت پیدا ہو گئی پہلے آدمؑ تخلیقی طور پر صرف ایک ضدِ نفسانی کے ساتھ پیدا ہوا۔ تخلیقِ شیطانی کے بعد اسے مزید اضلال کا سامنا پڑا اسی حالت میں اللہ تعالےٰ نے آدم و حوا علیہما السلام یعنی دونوں میاں بیوی کو جنت الفردوس میں رہنے کا حکم صادر فرمایا۔

اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کی عملی تفسیر کا آغاز جنت الفردوس میں دانۂ گندم کے ساتھ شروع کیا۔

چونکہ نفس کی فطری عادت اشتہا پسندی ہے اور اشتہائے نفسانی کو رفع کرنے کیلئے اسباب کی ضرورت ہوتی ہے۔ دانۂ گندم۔ اشتہائے خوراک کے مقابل تھا۔ اسی واسطے اسی کو دونوں میاں بیوی کے امتحان کیلئے تجویز فرمایا گیا۔ ارشاد ہوا:۔

یٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ؀

اے آدمؑ تو اور تیری بیوی دونوں جنت الفردوس میں آرام کرو اور اس باغ جنت میں جہاں جہاں سے چاہو اپنی حسب خواہش پھل کھاؤ۔ مگر اس درخت کے قریب نہ جانا۔ ورنہ ظالموں سے ہو جاؤ گے۔

ان آیات میں آدم و حوا علیہما السلام دونوں کو صرف نفس جسمانیہ کے ساتھ جنت کے پھل پھول حسب خواہش کھانے کی اجازت مل گئی۔ جس سے معلوم ہوا کہ رغبت کے ساتھ کھانا پینا معاصی کا باعث نہیں ہو سکتا۔ بلکہ امر مانع کی خلاف ورزی باعث عصیاں ہوتی ہے۔ اہل اللہ کا نفس تابع دل ہوتا ہے اور ان کا دل تابع فرمانِ خداوند تعالےٰ ہوتا ہے۔ اور وہ فرمان ذوالجلال کے خلاف نہیں ہو سکتے اور نہ نفس کے ہاتھوں لغزش کھا سکتے ہیں۔ بالخصوص انبیاء علیہم السلام معصوم عن الخطا ہوتے ہیں اور یہی معصومیت انکی بندگی کی علامت ہوتی ہے مگر اس مقام پر آدمؑ و حوا دونوں کو نفس نے لغزش نہیں دی بلکہ شیطان نے لغزش دی یہ لغزش ان کی ذاتی لغزش نہیں تھی بلکہ شیطان کی طرف سے خارجی لغزش ہوئی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ

(یعنی ان دونوں کو شیطان نے لغزش دی۔ اس بنا پر ان دونوں کو تو اس

جنت سے نکال دیا گیا جس میں وہ رہتے تھے۔)

اس تشکیلِ اضدادی اعلالی۔ یعنی نفسانی اور شیطانی کے ساتھ ساتھ آدم علیہ السلام کو اس جنت سے جہاں قطعیٔ آسودگی تھی ایک ایسی دُنیا کی طرف ہبُوط دیا جہاں زندگانی گزارنے کیلئے محنتِ شاقہ کے سوا کوئی دوسری راہ موجود نہیں تھی۔

ایک طرف آدم علیہ السلام اور ان کی بیوی دونوں اللہ کی ذات سے آشنا تھے اور یہ جانتے تھے کہ انہیں فضیلتِ علمیہ۔ انسانیہ اور اعمالِ نفسانیہ کے ساتھ اللہ نے نواز رکھا ہے۔ دوسری طرف دانۂ گندم کھانے سے انہیں نافرمانی کی خفت اور ندامت اٹھانی پڑی۔ تیسری طرف اپنے دشمن شیطان کی دُشمنی سے بھی مطلع ہو چکے تھے کہ اس دشمن کی دی ہوئی لغزش سے ہمارے لئے مزید اُلجھنیں پیدا ہو گئیں۔ چوتھی طرف دنیا کی محنتِ شاقہ کا سامنا تھا۔ ان مختلف النوّع تحریکوں کی موجودگی میں غلبۂ عشقِ الٰہی اور اس کی رضا کا حاصل کرنا وغیرہ مشکلات کے اتنے باب تھے جو آپؑ پر کھول دیئے گئے جن کو اضداد در اضداد، اعلال در اعلال کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔

فرشتوں کی بندگی کے مقابل انسان کو اتنی بڑی مشکلات کا سامنا بندگی کی بنائے اوّل ہے۔ معلوم ہوا کہ نفس اور شیطان کی تخلیق صرف انسانوں اور جنوں کیلئے ہوئی اور یہ دونوں ہی تکلّفِ نفس کے میدان میں اوّل و ثانی کی حیثیت رکھتے ہیں اور فرشتگانِ مقربین کو ایسے اضداد کا نہ کبھی سامنا ہوا ہے نہ ہو گا۔ دوسری وجہ بندگی کی راحتوں کو حاصل کرنیکی یہ ہے۔ جب تک حالتِ ضدّین نہ پیدا ہو تمیزِ حق و باطل نہیں ہو سکتی۔ نہ خوشی و غم کی تمیز ہی ہو سکتی ہے اور نہ جزا و سزا کا خیال پیدا ہو سکتا ہے۔

ایسے حالات میں امتحان کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا اور امتحان کی عدم

موجودگی میں جزا اور سزا لاحاصل ہو جاتے ہیں۔ فرشتوں کو نہ کسی وسوسہ کا اندیشہ ہے اور نہ بھوک و ننگ کا احساس ہے اور نہ انجام کار خوشی کا تعین کر سکتے ہیں ان کو جس حالت میں پیدا کیا گیا اس میں ان کی خوراک ذکرِ الٰہی ہے اور یہی ان کی غذا ہے۔ ذکر و فکر ان کے نورانی جسم کے ساتھ جان کی حیثیت رکھتا ہے یہی ان کی متاعِ زیست ہے انجام کی خوشی وہی پا سکتا ہے جس نے مقصودِ مطلق کی تلاش میں گوناگوں مصائب اور آلامِ زندگی کو برداشت کیا ہو۔ جس نے راہِ محبوب میں اپنا چہرہ گرد آلود کیا ہو اور طلب کی راہ میں دریدۂ حال ہوا ہو عشرتِ منزل کو اپنے محبوب کیلئے بار بار ترک کیا ہو اور متاعِ زیست کو قربان کیا ہو یہ قربانیاں غایت درجہ پر اولادِ آدم کے حصہ میں آئیں۔

اس مقصدِ بندگی کو تکمیل دینے کیلئے ایامِ دُنیا اور حادثات دنیا کے ہاتھوں میں آدمؑ کو دیدیا۔ جہاں بجلیاں کوندتی ہیں۔ زلزلے آتے ہیں۔ آئے دن آلام اور آشوب کا ظہور ہوتا ہے۔ اور ہر گام پر نئے طوفان اور نئی آندھیوں کیلئے اور نئے انقلاب آفرین حالات سے دوچار ہونے کیلئے ہمہ تن تیار رہنا پڑتا ہے۔ ان سب حادثات کی موجودگی میں عشق کی چنگاری کو محبت کی پھونکوں سے اور عملِ پیہم سے شعلوں میں تبدیل کرنا اور اپنی زندگی کو عشق کی آتش فشاں بھٹی بنانا طالبانِ حق کا مشغلہ ہے۔ بندگی کا تعین آسودگی پر نہیں ہوتا اس کی تشکیل حوادث پر ہوتی ہے۔

جنوں اور انسانوں کی تخلیق صرف عبادت کیلئے عمل میں لائی گئی اس عبادت کا پہلا ظہور دِل پر ہوتا ہے جو عقل و نفس کے درمیان معلق ہے۔ دِل پہ معبود کا تعین کر کے اس کی عبادت کرنا پُل صراط پر سے گزرنے کی مانند ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز تر ہے کیونکہ عقل و نفس جیسے

خوفناک عفریتوں کے درمیان عبادت کا گزارنا اور شیطان جیسے چالاک دشمن کی موجودگی میں عقل و دل کی اختراعات سے بچنا دشوار ترین مراحل سے ہے اگر عقلِ نفس کا رفیق ہو جائے تو اس کی بے ہنگم تنقیدات کی یورش بر سبیلِ نفس و شیطان صراطِ مستقیم سے ہٹا دیتی ہے۔

جب عقل اوہامِ نفسانی کا شکار ہو جائے تو حق کے راستوں میں باطل کی حمایت میں تنقید کرتا ہے۔ اکثر انسانوں میں نفسانی عقل نے ہی برگشتگی پیدا کی اور یہ برگشتگی زمرۃ الانسان میں فرعون و نمرود و ہامان اور شداد جیسی صورتوں میں نمودار ہو کر راہِ حق میں ہند بن کر امنِ عالم کی تباہی کا باعث بنتی رہی اور بندگی کی راہوں کو بار بار پامال کرتی رہی جس کے نتیجہ میں بار بار انبیاؑ جیسے عبّاد و زہّاد کو آسمانی صحائف کے ساتھ نفس و شیطان اور باغی عقول کا مقابلہ کرنے کیلئے مبعوث کیا جاتا رہا۔ اس بعثت کا تکرار بار بار انسانوں کو عبادت کی راہ پر چلانے کیلئے کیا جاتا رہا۔ تاکہ وہ عبادت کا صحیح مفہوم اخذ کرنے کے بعد تجویزاتِ الٰہیہ کے مطابق عباداتِ الٰہیہ کے فطری فریضہ کو از سرِ نو حاصل کر کے تلافیٔ مافات کریں۔ تلافیٔ مافات کی وہی صورت ہے جس کو آدمؑ نے اللہ کی پہچان کے ساتھ اعترافِ ذاتی کے ساتھ انجام دیا۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۔

"اے ہمارے ربّ! ہم نے اپنی جانوں پر نا انصافی کی۔ اگر تو ہم کو نہ بخشے اور نہ رحم کرے تو یقیناً ہم خسارے میں ہیں۔"

ایک معصوم عن الخطا نبی اللہ کسی خارجی لغزش کی بنا پر اعترافِ عصیان کر سکتا ہے تو ظاہر ہوا کہ یہ اعترافِ بندگی کا جزوِ اعظم ہے۔ بندگی کے ساتھ ساتھ احساسِ گناہ۔ انجام کا خوف اور اس کا اعتراف اللہ کے زیادہ قریب

کرنے کا باعث ہے۔ راہِ سلوک میں اس اعتراف کو اور اس خفت و ندامت کو اور اس قلق و اضطراب کو توفیقِ عبّاد کہا گیا ہے۔ یہ توفیقاتِ بندگی سے ایک توفیق ہے۔

اپنے خدائے رحمان و رحیم اور جبّار و قہّار کے سامنے اعترافِ گناہ کرنا شانِ بندگی میں داخل ہے۔ انانیّت کے باعث اعراض عن الاعترافِ جُرم بندگی قرار دیا گیا ہے۔ اس واسطے ترتیبِ اعمال کا آغاز نفس کے طوفانوں سے دوچار ہوکر اس کے تلاطم کے تھپیڑے کھانے کے بعد اعتراف کے ساتھ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے لیے الوہیت کا تعین انکے احکام کی فرماں برداری اور تجویزاتِ عبادت پر مرتّب ہوکر بندگانِ خُدا کیلئے نصاب بندگی بنتا ہے۔

اس نصاب بندگی میں قرآنِ مجید عقیدۂ توحید، عقیدۂ رسالت، عقیدۂ کتاب و سُنّت، عقیدۂ برزخ، عقیدۂ حشر و نشر، عقیدۂ جزا و سزا سب کو شامل کرتا ہے اور اپنے معتقدین کیلئے ایمانِ بالغیب کے ساتھ عبادات کا تعیّن۔ اقامتِ الصّلوٰۃ۔ انفاقِ مال۔ ایمان بالکتب اور عقیدۂ آخرت پر مرتّب کرتا ہے جس کی تفصیل ایمانِ باللہ۔ ایمان بالملائکہ۔ ایمانِ بالکتب ایمان بالرّسل عقیدۂ تقدیر خیر و شر اور عقیدۂ بعث بعد الموت اور ایمان بالصفّات باری تعالیٰ اور ایمانِ باسمائے باری تعالیٰ اجمالاً اور تفصیلاً کی حیثیت میں اقرارِ لسانی اور تصدیقِ قلبی پر مرتّب فرماتا ہے۔ اس کے بعد کلمۂ توحید اور کلمۂ شہادت ہمیشہ کیلئے بنائے عقائد بن کر مومن کیلئے تکمیلِ ایمان کا باعث بنتے ہیں۔

اس مرحلہ سے گزار کر اہلِ ایمان کو طہارتِ بدنیہ کے ساتھ جس کو غسل و وضو قرار دیا گیا عبادات کے فرائض انجام دینے کی تلقین کرتا ہے اس ایمانی فعل کے ساتھ جسم سے نجاستِ کفریہ معدوم ہو جاتی ہے۔ جس کا منشا مومن کو نفاقِ نفسانی و

شیطانی سے بچاکر راہِ راست پر عبادت کرنیکی تاکید کرتا ہے۔ اس کے بعد عبادت کے متعلق اس کو نوعیتِ معیّنہ پر بندوں کو بندگی کا حکم صادر ہوتا ہے۔

قرآنِ مجید میں بار بار اَقِیمُوا الصَّلٰوۃَ یعنی نماز قائم کرو کا حکم دیا جاتا ہے۔ صلوٰۃ سے مُراد وہ نماز ہے۔ جس کو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلّم نے پنجگانہ طور پر ادا کیا۔ جن کی تفصیل قرآنِ مجید میں موجود ہے۔ فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشائی کی نماز جن کے اوقات کے ثبوت تصریحات کے ساتھ ملتے ہیں۔ نیز سُنّت اور نوافل کی صورت میں بھی عبادات کی تعلیم فرمائی گئی ہے۔

بندگی کے ہر میدان میں فرض، سُنّت اور نوافل کی تعلیم ملتی ہے۔ اس مقام پر تشریح عبادت کیلئے اس مفہوم کا ہونا بہت ضروری ہے۔ کہ عبادت سُنّتِ خداوند تعالےٰ نہیں ہو سکتی۔ اس واسطے کہ یہ علامت بندوں کیلئے ہے۔ ادائیگی عبادت کا تعلق سب سے اوّل نبیوں کے ساتھ ہے۔ نبیوں کی ادائیگی کے ساتھ وہ عبادت سُنّت بنتی ہے۔ اللہ تعالےٰ ادائیگی عبادت سے منزہ ہے۔ بندگی فعلِ خداوندی نہیں ہو سکتی۔ اس واسطے اس پر سُنّتِ اللہ کا کبھی اطلاق نہیں ہو سکتا۔ عبادت فرض ہو یا سُنّت، نفل ہو یا مستحب، ہر صورت میں سُنّتِ نبی اللہ ہے صرف اس پر حکمِ خداوندی کا اطلاق ہوتا ہے۔

حکمِ خداوندی کے بعد عبادات ومعاملات جملۃً سُنّتِ نبی کی صورت میں فرض وسُنّت اور نفل بنتے ہیں۔ لہٰذا اس سُنّت پر ایمان رکھنا شرک سے نجات دیتے ہوئے عبادت کا جزوِ اوّلیٰ ہوکر بندے کو عبادت کے مبادیات دیتا ہے۔ قرآنِ مجید نے اس عبادت پر اس واسطے زور دیا تاکہ بندہ عبادت کے ساتھ محض اللہ کا ہوجائے اور اس کا ہوجانے کے بعد بندگی کے وہ فرائض بھی انجام دے جو معاملات کی صورت میں اس پر عائد کیے گئے ہیں۔ اس

صورت میں عبادات کو لازم کی حیثیت دی گئی ہے اور معاملات کو ملزوم کی۔ جو معاملات بندگی سے الگ ہوں۔ ان میں انانیتِ نفسانیہ آجاتی ہے اور غرورِ نفس غالب آکر اس کو نفس کی بندگی کیلئے مجبور کرتا ہے۔ یہی مجبوری نافرمانیٔ خدائے تعالےٰ کا باعث بنتی ہے۔ اور جملہ معاصی انہی معاملات سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ بندوں کی اخلاقی صورت کو بگاڑ کر مسموم کر دیتے ہیں۔ اور یہ سمیت بداخلاقی کی صورت میں فرد سے افراد کو اپنی لپیٹ میں لے کر بندگی کی سعادتوں سے محروم کر دینے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ تمام بداخلاقیوں کا وجود اللہ کی عبادت سے الگ ہونے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے "قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی" جس نے عبادات سے تزکیۂ نفس کیا وہ فلاح کو پہنچا۔ یہی تزکیۂ نفس حتمی طور پر سرورِ کائنات فخرِ موجودات علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عطا ہوا جس پر آپ نے خُلقِ عظیم پایا اور آپؐ کیلئے فرمایا گیا "اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ" یعنی آپؐ صاحبِ خُلقِ عظیم ہیں۔ اخلاق کا دار و مدار اعمالِ صالح پر ہوتا ہے۔ اس بنا پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایامِ طفولیت سے لیکر بعثت تک جن اعمال کا صدور رہا۔ اور بعثتِ نبوت سے دمِ آخر تک آپؐ پر جو احوال، اقوال اور اعمال مرتّب ہوئے۔ وہ سب کے سب آپؐ کی عبادات و معاملات پر محمول ہوئے، اور یہ سب معمولاتِ مجوّزاتِ باری تعالےٰ تھے۔ جن کو حتمی بندگی کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآنِ مجید کے ان اشارات اور احکام کے ساتھ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہی تقوی کی صحیح بنیاد ہو سکتا ہے۔ اور ان ہی پر بالعبادات تقوی کو مقامِ کمال مل سکتا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالےٰ ہوتا ہے:

مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا ط

جو کچھ تمہیں اللہ کے رسول دیں۔ اس پر عمل کرو، اور جن چیز سے منع کریں اس سے باز آجاؤ۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی سُنتِ پاک سے جو کچھ تمہیں ملے اس پر عمل پیرا ہو کر بندگی کا ثبوت دو۔ اور جس چیز سے منع کریں اس سے باز آکر تعمیلِ حکم کا بندگی کے ساتھ ثبوت مہیّا کرو۔ خلافِ پیغمبرؐ ہر قسم کی بندگی نامقبول ہے۔ اِن عبادات کی پانچ بنائیں رکھی گئی ہیں۔ (۱) اللہ اور اُس کے رسولؐ مقبول پر ایمان لانا۔ (۲) نماز قائم کرنا۔ (۳) زکوٰۃ کا ادا کرنا (۴) رمضان المبارک ماہِ طیبّہ کے روزے رکھنا۔ (۵) بشرطِ استطاعت حج کرنا۔ ان بناؤں میں سے کسی ایک کا بھی عمداً انکار کرنا کفر ہے ان سب میں سے زیادہ تاکید پنجگانہ نماز کی فرمائی گئی ہے یہاں تک ارشادِ باری ہے۔

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ؕ

نماز قائم کرو اور مُشرک نہ بنو۔ قیامت کے دِن جنّت کے کناروں پر کھڑے ہو کر اہلِ جنّت جہنمیوں سے سوال کریں گے۔ " مَا سَلَکَکُمْ فِیْ سَقَرَ" کون سی چیز تمہیں جہنم میں لے گئی تو جہنمی اس کے جواب میں کہیں گے۔ قَالُوْا لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ یعنی نماز نہ پڑھنے کی بدولت ہم کو جہنّم کا ایندھن بنایا گیا۔ حدیث شریف میں قرآنِ مجید کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا گیا۔

" اَوَّلُ مَا یُحَاسَبُ بِہٖ الْعَبْدُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ فِی الصَّلٰوۃِ "

یعنی قیامت کے دن جس چیز کا سب سے پہلے حساب ہوگا۔ وہ نماز ہے پھر حدیث شریف میں آیا ہے۔

اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ فَمَنْ اَقَامَھَا فَقَدْ اَقَامَ الدِّیْنَ وَمَنْ ھَدَمَھَا فَقَدْ ھَدَمَ الدِّیْنَ "

یعنی نماز دین کا ستون ہے۔ جس نے اس کو قائم کیا اس نے دین کو قائم کیا جس نے اس کو گرا دیا اُس نے دین کو گرا دیا۔

اس حدیث شریف سے ترک الصلوٰۃ کی وعید کا اندازہ لگ سکتا ہے کہ یہ کتنا بڑا گناہ ہے۔ گویا ایوانِ اسلام کی بنیادوں کو ہلا دینے والا جُرم ہے اور اس کے قیام کے ساتھ کتنی بڑی بشارت ہے۔ کہ قیام صلوٰۃ کے ساتھ ایوانِ اسلام کو تقویت ملتی ہے۔ علاوہ ازیں قرآنِ مجید میں حصُولِ اخلاقیات کیلئے اور اجتناب معاصی کیلئے نماز کو اس طرح سبب بیان فرمایا ہے۔

"اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ"

یعنی نماز بے حیائی اور بُری باتوں سے روکتی ہے۔ اور ذکر الٰہی اس پر افضل ہے۔ یہاں ذکرِ الٰہی کو نماز پر اس لئے افضل قرار دیا گیا ہے۔ کہ کلمہ طیبہ وہ بنیادی ذکر ہے۔ جس کے پڑھنے سے ایمان میسّر آتا ہے۔ اور ایمان کے بعد ہی نماز فرض ہوتی ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں مذکور ہے:

"اَفْضَلُ الذِّکْرِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ"

یہ کلمہ عقیدۂ توحید سے متعلق ہوکر تمام عقائد کی بنیاد بن جاتا ہے۔ جُملہ عقائد اور عبادات و معاملاتِ اسلامیہ اس پر متفرع ہوتے ہیں۔ اس مقام پر اس اعتراض کا جواب کہ بعض اہل صلوٰۃ سے بے حیائی اور گناہ کا سرزد ہونا آیت کے منافی ہے۔ درحقیقت مذکورہ تمہید جو نفس و شیطان کے اضداد کے مقابلے سے متعلق ہے۔ صحیح ایمانیات پر عبادت کی ترکیب کی وضاحت کیلئے اس واسطے بیان کی گئی ہے۔ کہ عبادات سچے ایمان پر مرتب ہونے کے بعد صاحب عبادت کو گناہ سے بچاتے ہیں۔ اور اعترافِ گناہ کی تعلیم دیتے ہیں۔ جو عبادت ایمان کی بنا پر کی جائے وہ یقیناً

بے حیائی اور بُری باتوں سے روکتی ہے۔ جس کا ثبوت انبیاءؑ، صدیقین، شہداء
اور صالحین کی متقیانہ عبادات سے ملتا ہے۔ ان کی سعادت مندیوں پر تاریخ
اسلام مرتب ہوئی ہے۔ جن سے کوئی باشعور انکار نہیں کر سکتا۔

بصورتِ دیگر کم از کم اتنا مفہوم ہو جاتا ہے۔ کہ نمازی سے حالتِ نماز میں
کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا۔ اس نماز میں عوام کی نماز بھی شامل ہے۔ نماز کے
مجموعی اوقات کو جمع کیا جائے۔ تو پانچ چھ گھنٹے بن جاتے ہیں۔ مہینے کے
تیس ۳۰ ایام کو روزمرّہ کے چھ گھنٹوں سے جمع کیا جائے تو ایک سو اسی ۱۸۰ گھنٹے بنتے
ہیں۔ اور ایک ۱۸۰ سو اسی گھنٹوں کے بارہ گھنٹے یومیہ کے حساب سے پندرہ ۱۵ یوم
بنتے ہیں۔ اور شب و روز کے چوبیس ۲۴ گھنٹوں کے حساب سے ساڑھے سات
دن بنتے ہیں۔ اس تناسب سے ایک سال میں تین ماہ بنتے ہیں۔ اس حساب
سے اصل کی بناء پر بلوغت سے لیکر ساٹھ ۶۰ سال کی عُمر تک پندرہ سال بنتے ہیں
اور خوش قسمتی سے اگر سو سال عمر ہو جائے تو اس کے ۲۵ سال بنتے ہیں۔

گویا جو شخص ساٹھ ۶۰ سال یا سو ۱۰۰ سال تک متواتر نماز پڑھتا ہے اور وہ صاحبِ
ترتیب ہو تو وہ پندرہ ۱۵ سال اور پچیس ۲۵ سال مسلسل گناہوں سے بچ جاتا ہے
اس واسطے کہ قیدِ نماز میں کسی فعلِ بد کا صُدور نہیں ہو سکتا۔ پہلی صورت میں
نماز کا تقویٰ پر انحصار ہے۔ جس میں مُتقی کاملاً بے حیائی اور بُری باتوں سے
بچتا ہے۔ اور اللہ تعالےٰ اس کو گناہوں سے بچاتے ہیں۔ یہ خواص کی نماز
ہے۔ اور دوسری حالت میں اوقاتِ نماز گناہوں سے بچاتے ہیں۔ جو
عوام کی نماز ہے۔ پندرہ ۱۵ سال یا پچیس ۲۵ سال یقیناً اللہ کے حضور میں اُسکی
نجات کا باعث بن سکتے ہیں۔ اس واسطے بہرحال نماز بے حیائی اور بُری
باتوں سے روکتی ہے۔ عبادتِ اسلامی، تہذیب و تمدن میں اخلاق کی

بنائے اوّل ہے۔ اور انجام کار سعادت مندیوں پر انتہا کرتی ہے۔ جسمیں دُنیا و عُقبیٰ کی فلاح ثمر کے طور پہ بندگی کرنیوالے بندوں کو میسّر آتی ہے۔

یہ لوگ راتیں اپنی کروٹوں پر اللہ کی عبادت میں بسر کرتے ہیں۔ اور قائم اللّیل بنتے ہیں۔ اور دنوں کو روزہ دار ہو نیکی بنا پر صائم النہار کہلاتے ہیں۔ اور نفس و شیطان کا مقابلہ کرتے ہوئے سچائیوں کی تبلیغ کرتے ہیں یہ لوگ ناجی اور نجات دہندہ ہوتے ہیں۔ یہ اللہ کے پاکباز بندے جن کے سینے محبت الٰہی سے سرشار ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھیں شفقت سے معمور ہوتی ہیں۔ اور ان کا تبسّم حیات بخش ہوتا ہے۔

ان کے اشارے اور کنائے بنی نوعِ انسان کیلئے پیغامِ رحمت ہوتے ہیں۔ مصیبت میں، دُکھ درد میں، حادثات میں، حالتِ خوف میں اور ہر حالت میں کامل صبر و شکر کے ساتھ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کے فرمانِ باری تعالےٰ کے ساتھ اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرتے ہیں۔ اور استقامتِ ایمانی کا کامل بندگی کے ساتھ ثبوت پیش کرتے ہوئے ہر میدان میں تائیدِ ایزدی حاصل کرکے سرفراز ہوتے ہیں۔ ان لوگوں پر ہمہ وقت رحمت کے فرشتے نازل ہوتے ہیں۔

قرآن مجید اور کوشش

قرآن مجید نے عالم اسباب سے روگردانی کو کفرانِ نعمت سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن مجید کی یہی جامع تعلیم اور یہی جامع تبلیغ تھی جس نے صورتِ اسلام کے ساتھ خلافِ فطرت صورت رہبانیت کی ہمیشہ کے لئے ریاستِ اسلامیہ سے بیخ کنی کر دی۔

اور لَا رُھبانیۃَ فِی الْاِسْلَام کی صدائے بازگشت کے ساتھ اپنے صالحانہ فقر و غنا کی بنیاد ڈال دی جس میں پرستش کو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مختص کر دیا گیا اور اپنے پیروکاروں کو لومۃ لائم سے بے نیاز ہو کر اسلام کے عمل پیہم کی کچھ اس طرح تعلیم دی کہ اس کو ماننے والے کہیں فقر و غنائے حیدری کی صورت میں، کہیں خلفائے راشدین کی صورت میں، کہیں خالد بن ولید کی صورت میں، کہیں پُر جلال عساکر اسلام کی صورت میں میدان عمل میں گامزن نظر آتے ہیں۔

خوش بختی سے آج سرزمین پاکستان میں اس قرآن مجید کا ۱۴۰۰ سو سالہ جشن نزول منایا جا رہا ہے یہ اس خدائے علیم و بصیر کا کلام ہے جو مختار مطلق ہے جسکے قبضۂ قدرت میں سارے جہانوں کی بادشاہت ہے جس نے ہمیشہ انسانیت کو اپنے برگزیدہ بندوں کے ذریعے راہ راست پر چلنے کی ہدایت دی اور حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے کا معیار قائم کیا اور دعوت حق کو سمجھنے کے لئے انسانوں کو عقل و دل و نگاہ جیسی ہمہ گیر صلاحیتوں سے نوازا اور فطری ہدایتوں کی روشنی میں انہیں میدان زلیست میں تجسس کے مواقع دیتا رہا ہم خدائے ذوالجلال کی حمد و ثنا کے ساتھ اس کے ازلی، ابدی اور سرمدی کلام پاک کا جشن منا رہے ہیں۔ جو چودہ سو سال قبل خدائے لم یزل کے آخری اور برگزیدہ بندے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر سرزمین عرب میں نازل ہوا تھا جس کی سعادتیں اور برکتیں تواتر کے ساتھ مسلمانان عالم کے ساتھ شامل حال رہیں جو انہیں مشکل ترین ادوار میں فتح و ظفرمندی سے ہمکنار کرتی رہیں۔

مسلمانان عالم کے صالحانہ کارناموں کی شہادت تاریخ اسلام کی صورت میں ہمیشہ کے لئے موجود ہے۔ قرآن مجید اپنے دائمی تسلسل کے ساتھ اپنے پیروکاروں کے ذریعے انسانیت کی رہنمائی کرتا ہوا دور جدید کی رہنمائی کے لئے بھی ویسے کا ویسا یعنی من و عن ملت اسلامیہ کے پاس موجود ہے۔ اپنے سچے وعدوں کے ساتھ ابدالآباد تک غیر مبدل ہے۔ اور ہمیشہ انسانیت کی رہنمائی کرتا رہے گا۔ قرآن مجید نے اپنے غیر مبدل ہونے کی خدائی دلیل اس طرح پیش کی۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔

نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْن

(ہم ہی اس کے نازل کرنے والے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں)
یہ وعدہ زمانے گزرنے کے ساتھ ساتھ بکمال پورا ہوتا رہا۔ اور اس کے لافانی ہونے کی دلیل اس کا اعجاز انگیز نزول ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسری آسمانی کتابیں ردّو بدل اور ترمیم کا شکار ہو چکی ہیں۔ باوجود اس کے کہ پہلی آسمانی کتابیں سب کی سب من جانب اللہ تھیں مگر جزوی آئین پر مشتمل تھیں۔ اس لئے حالات زمانہ نے انسانی مجلس کو مجبور کیا کہ وہ مکمل آئین کے لئے کسی نئے ضابطہ حیات کی تلاش کرے۔ چونکہ پہلی کتابیں مکمل ضابطہ حیات نہ ہونے کی بنا پر انسانی طبائع کو مطمئن نہ کر سکی تھیں۔

اس لئے خدائے علیم و بصیر نے اپنے اُن وعدوں کو جو پہلے لوگوں سے کئے تھے اُن مقدس وعدوں کو اس کتاب موعود کے ساتھ پورا فرمایا۔ اور جس بندے کے ذریعے اس کتاب موعود کو دینے کا وعدہ فرمایا تھا۔ وہ نبیٔ موعود حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک تھی جن کے ذریعے کتاب بھیج کر اس وعدے کو بھی پورا فرمایا یعنی کتاب موعود نبی موعود کے ذریعے حسب وعدہ اہل عرب تک پہنچی۔
ذَالِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ یعنی یہ وہی کتاب موعود ہے جو من جانب اللہ ہے اور اللہ تعالےٰ کا کلام ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ آفرینش آدم سے لے کر آج تک انسانیت اطمینان کامل کی تلاش میں سرگرداں رہی اور اطمینان کامل حاصل کرنے کے لئے، نظام تخلیق نظام حیات اور نظام کائنات پر مسلسل غور و خوض کرتی رہی اور اس فطری غور و خوض میں امکان عقل و دانش کے ساتھ اپنے لئے کئی راہیں متعین کیں مگر کامل آئین نہ ملنے کی بنا پر دوسری آنے والی مجلس انسانیہ نے ان تعینات کو نامکمل قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا۔

یہ استرداد من حیث المجلس انسانیہ نزول فرقان حمید تک جاری و ساری رہا۔ انسانیت کا مطالبہ آئین فطرۃ کو بکمال دیکھنے کے لئے استدلال قاطعہ چاہتا تھا، اور فکر

انسانیہ ہمیشہ استدلال کے سامنے اپنے ہتھیار ڈالتی رہی۔ ہر دلیل فکر انسانیہ کے سامنے برہان چاہتی ہے۔

انسانی نظریہ کا ہمیشہ یہ خاصہ رہا ہے کہ وہ دلیل و برہان کو ایک ہی میدان میں دیکھنے کی طلبگار رہی ہے۔ چنانچہ پروردگار عالم کی بھی ہمیشہ یہ سنت رہی ہے کہ اس نے مزاج انسانی کے مطابق انسان کو دلائل قاطعہ کے ساتھ دعوت حق دی۔ یہ دعوت براہین بالاعجاز کے ساتھ دی جاتی رہی۔ قرآن مجید کی مخاطب اول سرور کائنات فخر موجودات حضرت محمد مصطفٰے احمد مجتبٰے کی ذات ستودہ صفات ہے۔ قرآن مجید اللہ تعالےٰ کا کلام ہونے کے اعتبار کے ساتھ سب سے پہلے انسانوں کے لئے نظریہ توحید کا تعین کرتا ہے تاکہ انسانی فکر و عمل کو ایک لازوال مرکز سے وابستہ ہو کر اتحاد عمل کے ساتھ ایک مقصد عظیم کی طرف چلنے کا موقعہ مل سکے۔ اس فکری مرکز عظیم کی اساس اول غار حرا میں اس طرح رکھی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ازلی و ابدی اور سرمدی محبوب پاک حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب فرما کر بزبان جبریل امین اس طرح حکم فرمایا۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ

یعنی پیدا فرمانے والے رب کے نام سے پڑھیئے۔ نزول کے اعتبار سے یہ قرآن مجید کی سب سے پہلی آیت ہے جس نے اپنے مخاطب کو اپنے رب کے نام سے تلاوت کرنے کا حکم دیا۔ اور خدا کے آخری بندے کی زبان اقدس نے خدائے برتر و اعلےٰ کی وحدانیت کا اقرار اس کی صفت خالقیہ کی دلیل کے ساتھ کیا اور مخلوق لفظ کو خلق کے ساتھ تعبیر فرما کر مدلول کی حیثیت دی۔ اس لئے کہ انسانی نظروں کے سامنے مخلوقات ایک مادی صورت ہونے کی وجہ سے برہان ربانی بن جاتا ہے۔ قرآن مجید اپنے جملہ احکامات کے ساتھ اشارتاً، کنایتاً، حقیقتاً، مجازاً استدلال اور براہین کے ساتھ بار بار اور مسلسل نظریہ توحید کی تعلیم دیتا ہے۔ اور اس نظریہ کی امانت اور حفاظت کے ساتھ عالم اسباب

ہیں جسم و جان اور کائنات کو سمجھنے کے لئے اور مقصود مطلق کی طرف رواں دواں رہنے کے لئے نظریۂ بعثت نبوت کو اعتباری حیثیت دے کر وحی و الہام کے ساتھ پوری انسانیت کے لئے رشد و ہدایت کی بنیاد ڈالتا ہے۔ خدائے لم یزل کی گوناگوں کرشمہ سازیوں کے ساتھ اعتبار نبوت کی معجزانہ کرشمہ سازیوں سے متاثر ہو کر لوگ جوق در جوق خدا کی وحدانیت اور رسول پاکؐ کی رسالت پہ اور اسلام پہ ایمان لاتے رہے۔

یہ بن دیکھا ایمان ہے جس کی بنیاد صرف اور صرف نبوت کے اعتبار پر رکھی گئی۔ اسلام ہر ایمان والے کو علی وجہ بصیرت ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے کسی ایسی حقیقت پہ جو بظاہر نظروں سے اوجھل ہو مگر اس کے مظاہرات اس کے وجود پہ دلالت کرتے ہوں اور کوئی راہنما اسی دلالت کے ساتھ اس چھپی ہوئی ہستی پہ ایمان لانے کی دعوت دے رہا ہو۔ تو ایسے چھپے ہوئے خدا پر علی وجہ بصیرت ہی ایمان لایا جا سکتا ہے نہ کہ علی وجہ بصارت۔ علی وجہ بصارت رویت کی خداوند تعالےٰ نے نفی کر دی۔ فرمایا لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ، کوئی آنکھ اس کی ذات کا مطلقاً ادراک نہیں کر سکتی لیکن قرآن مجید میں کہیں بھی نہیں فرمایا گیا کہ لَا يُدْرِكُهُ الْبَصِيْرَۃُ کہ کوئی بصیرت بھی اس کو نہیں دیکھ سکتی بلکہ اللہ تعالےٰ نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ان الفاظ کے ساتھ لوگوں کو دعوت دینے کا طریقہ تعلیم فرمایا، کہ آپ ان الفاظ میں لوگوں کو فرما دیجئے :۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣعَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ط

آپ لوگوں کو فرما دیجئے کہ میں تمہیں علی وجہ بصیرت دعوت حق دیتا ہوں اور میرے صحابہ کرام بھی علی وجہ بصیرت ہی آپ لوگوں کو دعوت حق دیتے ہیں۔

بن دیکھے ایمان کی تصدیق علی وجہ بصیرت ہی ہو سکتی ہے۔ ورنہ خدا کے لئے کسی

شہادت کے بغیر ایمان لانا شرعاً ناجائز ہوگا۔ اگر یہ کہہ دیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کو کسی مخلوق نے کبھی نہیں دیکھا لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ کے فرمان کی موجودگی میں جبرئیل امین کی آنکھ بھی اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایک لاکھ کئی ہزار انبیاء و مرسلین میں سے کسی نے کبھی ذات خدا کا دیدار نہیں کیا۔ کسی ایک نے بھی نہیں دیکھا یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام نے بھی ذات خدا کا دیدار نہیں کیا بلکہ اُن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی تجلیاتِ صفات کا دیدار کرایا تھا، تو ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لانا ہی ناممکن ہو جاتا ہے۔ خدا کے آخری نبی فرماتے ہیں کہ میں خدا کی طرف سے آخری رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ پھر فرماتے ہیں کہ میں نے معراج قدس میں اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا، اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوا۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى اللہ تعالیٰ کا دیدار کرنے میں آنکھ میں چندھاہٹ نہیں آئی جس طرح موسیٰ علیہ السلام صرف تجلیات کی جھلک بھی برداشت نہ کر سکے اور مدہوش ہو کر گر گئے۔ مگر نبی پاک صاحب لولاک نے ذات خدا کا دیدار کیا۔ دو بدو ہو کر کیا۔ مگر ذرہ بھر بھی غشی وغیرہ نہیں ہوئی بلکہ زیارت کے دوران اللہ کی آیات اور اللہ کے نورِ ذات کو دیکھنے میں آپ کی آنکھ تک نہیں جھپکی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اگر اللہ تعالیٰ کی زیارت نہیں ہوئی اور آپ نے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا تو پھر اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آیات پر کیسے ایمان لایا جائے گا کہ یہ کس خدا کا کلام ہے جس کو قرآن بیان کرنے والے نے کبھی نہیں دیکھا۔

قرآن مجید نبی اللہ کے اعتبار سے خدا کا کلام تسلیم کیا جاتا ہے اور خدا کا نبی کسی کی شہادت پر نبی ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ نے خدا کو دیکھا اور فرمایا کہ میں اس کی طرف سے بھیجا گیا ہوں۔ ایک حدیث شریف میں حضورؐ نے فرمایا لِیْ مَعَ اللّٰهِ وَقْتٌ لَا يَسَعُنِیْ فِيْهِ مَلَكٌ مُقَرَّبٌ وَلَا نَبِیٌّ مُرْسَلٌ،

میرے لئے ایک وقت ہے جب میں اللہ کے پاس ہوتا ہوں یا اللہ سے ملتا ہوں یہ ایسا وقت ہوتا ہے یا ایسی مجلس ہوتی ہے کہ اس میں کوئی فرشتہ یا کوئی نبی یا کوئی رسول بھی نہیں سما سکتا۔

یہ ماننا پڑے گا کہ ہر نبی اللہ کو کسی نہ کسی طریقہ پر معراج نصیب ہوا جس میں ہر نبی اللہ نے کسی نہ کسی طرح تجلیات خداوندی کا دیدار کیا مگر سب سے بڑے سب سے اعلےٰ وارفع نبی اللہ نے اللہ تعالےٰ کا دیدار کیا۔ تب ہی جا کر اللہ تعالےٰ کے واجب الوجود ہونے کی شہادت ملتی ہے اور تب ہی جا کر اس کی وحدانیت پر ایمان لایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے سوال کرنے والوں کو فی البدیع جواب دیا تھا کہ میں اللہ تعالےٰ پر اس لئے ایمان لایا ہوں کہ میرے محبوب پاک حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ خدا ہے اور وہ وحدہٗ لاشریک ہے تو اُس شہادت نبوی کے مطابق خدا پر ایمان لایا ہوں تو سائلین نے پھر سوال کیا کہ اگر نبی اللہ گواہی نہ دیتے تو پھر آپ کیا کرتے اس پر اقبال نے کہا کہ پھر تو اعتبار ہی ختم ہو جاتا جب اعتبار ہی ختم ہو جائے تو ایمان لانا بے معنی ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید نے ایمان علی وجہ بصیرت لانے کا حکم دیا۔ ایک جگہ فرمایا۔
فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ
درحقیقت ان کی آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ اُن کے دل سینوں میں اندھے ہو جاتے ہیں۔ اس آیت میں دل کی آنکھ ثابت ہو گئی پس اُسی دل کی آنکھ کو قرآن مجید نے بصیرت کا نام دیا ہے۔

قرآن مجید وحدانیت پر اس انداز فکر کے ساتھ دعوت دیتا ہے کہ باطل فلاسفر اس دعوت اور قبولیت کو رد کرنے کی کوئی دلیل بھی نہ لاسکے۔ یعنی کسی آنکھ نے بھی اگر اس کو ذاتی و صفاتی طور پر نہیں دیکھا۔ صرف دلائل علمیہ اس شہادت کے لئے کافی نہیں

ہو سکتے۔ شہادت روئیت پر موقوف ہے، روئیت ہو گی تو علم وحکمت کا سہارا لیا جائے گا جو قرین مصلحت ہو گا۔

قرآن مجید نے نظریہ توحید پوری انسانیت کی فلاح و نجات کے لئے پیش کیا اور اس عقیدے کی رہنمائی کے لئے نظریۂ ختم نبوت اس لئے پیش کیا کہ ایک نظریہ اتحاد انسانیت انجام کار ایک ہی رہبر اعظم کے ذریعے ایک ہی ضابطہ حیات سے وابستہ ہو کر ایک ہی خدائے لم یزل کا محکوم ہو کر امن عالم کے لئے مژدۂ جانفزا بن کر ارضی فساد کو ہمیشہ کے لئے دور کرنے کا آخری ذریعہ بن سکے اور انجام کار نجات پائے اس طرح پوری انسانیت حَسَنَ الدُّنیَا وَالْاٰخِرَۃ کی حق دار ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید نے نظریہ آخرت پیش کر کے نوع انسانیت پر احسان عظیم فرمایا۔ اس واسطے کہ آخرت کے تعین کے لئے انسانی ذہنی مقدمات اور انسانی باہمی مقدمات کا فیصلہ سوائے نظریہ آخرت کے کسی طور پر بھی ممکن نہیں ہو سکتا۔

قرآن مجید اپنے آئین فطرت ہونے کے ساتھ نظریہ نبوت نظریہ آخرت اور نظریہ توحید کو مکمل کرنے کے لئے اپنے لافانی نصب العین تک پہنچنے کے لئے پارسائی حاصل کرنے کے ضمنی اعمال صالحہ کی تجویز پیش کرتا ہے۔ قرآن مجید کے مجوزہ اعمال اس قدر ہمہ گیر اور منصفانہ ہیں کہ روح اور مادہ کو انصاف کے ساتھ حقیقت تک پہنچنے کے لئے تجسس کرنے کی تعلیم دیتے ہیں اور اس تعلیم سے آگے بڑھنے اور گوہر مقصود پانے کی زبردست ترغیب اور زبردست قسم کی تحریص ملتی ہے قرآن مجید کی جملہ تعلیمات پر غور و خوض کرنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیروکاروں کو ایک صالح ترین جماعت کی حیثیت سے متمدن اور مہذب دیکھنا چاہتا ہے۔ تاکہ وہ دونوں جہانوں کی سعادت مندیوں سے کماحقہ بہرہ ور ہو سکیں اور اس منظم ترین صالح جماعت کا ماحصل مسلمانوں کی اخلاقی حیثیت کو ہمہ گیر کرنا ہے اور یہ کہ قرآن مجید اپنے پیروکاروں کو ہر شعبہ زندگی پر محیط دیکھنا چاہتا ہے۔ اس طرح قرآن مجید دعوت حق کے میدانوں میں اپنے پیروکاروں

کو صف اوّل دیتا ہے اور امامت کبریٰ کے لئے جن صفات کی امکانی ضرورت ہو سکتی بھی وہ سب صفات اُسے تفویض کرتا ہے وہ اسی صالحانہ ہمہ گیری کی بنا پر اپنے ایک ایک فرد کو اس کی انفرادی حیثیت میں اس طرح فوزِ عظیم کی بشارت دیتا ہے جس سے ہر فرد کے حوصلے بلند ہو جاتے ہیں۔ اس کے لئے قرآن مجید اللہ کا ارشاد اس طرح بیان فرماتا ہے:۔ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا یعنی جس کسی نے بھی اللہ تعالےٰ کی اور رسول پاکؐ کی اطاعت کی وہ منزلِ مقصود تک پہنچا۔ پھر اپنے ماننے والوں کی اجتماعی حیثیت کی بنیادیں اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ کے ساتھ ڈالتا ہے۔ یعنی اے ایمان والے مسلمانو! اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی اور اپنے مسلمانوں میں سے ہی کسی اعلےٰ ترین مسلمان کو اپنا امیر بنا کر اس کی اطاعت کرو۔ قرآن مجید اپنی فطری رہنمائی میں حاکم مطلق کا منصب عظیم خدائے لم یزل کے سپرد کرتا ہے خدا اپنی نیابت کیلئے اپنے پسندیدہ نبیوں کو تجویز کرتا ہے اور تاریخ نیابت پر تبصرہ کرتے ہوئے ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو باعتبارِ نبوت اس کا پہلا امام ثابت کرنے کے بعد فرمانِ الٰہی کے بموجب اُن کے سر پر تاج خلافت رکھتا ہے۔ پھر یہی نیابت ایک لاکھ کئی ہزار انبیاء و مرسلین پر تقسیم کرتا ہے۔

انسانی مزاج کے مطابق آخری آئین مسلمانوں کے ذریعے پوری انسانیت تک پہنچانا مقصود قدرت تھا۔ چنانچہ آئین کا ایسا ہونا کہ وہ صورت ازل، صورت ابد، صورت روح، صورت مادہ، صورت نار، صورت نور، صورت انسان، صورت کائنات، صورت معانی، صورت حقائق اور تصوّر حقیقتِ حقہ کا تعین کرتے ہوئے ایسا نصاب تعلیم انسانیت کے لئے مرتب کرے جس کی تعلیم اتنی جامع ہو کہ طالب علم فراغت کے بعد ہمہ گیر شخصیت بننے کے بغیر نہ رہ سکے۔ نصاب تعلیم

کا مقصد عند اللہ وہی ہونا چاہیئے جس کا اظہار آدم علیہ السلام کے علم الاشیاء کے ساتھ کیا گیا تھا۔ چونکہ انسان جس کائنات میں پیدا ہو کر آباد ہوئے یہ مادی کائنات ہے جو ایک قسم کا معمل خانہ ہے جس پہ اشیاء عالم کی تحقیق کرنا اور تجربات کرنا انسانیت پر ضروری تھا۔ جملہ اشیاء کا علم دینے کے بعد فرشتوں سے تعارض فرمایا گیا۔ فرشتے ایک مقدس مخلوقات ہیں جن سے کبھی گناہ سرزد نہیں ہوتا۔ وہ سب غیر مکلف ہیں۔ وہ بلا تکلف تسبیحات میں مصروف رہتے ہیں۔ جب آدم علیہ السلام والا علمی پرچہ ان کے سامنے پیش کیا گیا کہ وہ بھی آدم علیہ السلام کی طرح اشیاء عالمین کے نام بتائیں تو انہوں نے اعتراف عجز کیا اور کہا کہ ہمارے پاس اتنا علم نہیں جتنا تو نے آدم علیہ السلام کو عطا فرمایا۔ وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا

نیابت وخلافت کے لئے اور تصرف کے لئے یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جملہ اشیاء عالمین کے نام سکھلا دیئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بصورت خلافت زمین پر کامل تصرف حاصل کرنے کے لئے علم الاشیاء کو ایک لازمی مضمون قرار دے دیا۔ اسماء لفظ اسم کی جمع ہے یعنی کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کا اسم نہ ہو اور جس چیز کا نام ہو وہ مسمی کہلاتی ہے۔ سب اشیاء عالمین کے اللہ تعالیٰ نے نام رکھ دیئے اس طرح سب اشیاء عالمین کے نام مسمیات کہلائیں گے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو جملہ مسمیات کے علوم سے مالا مال فرما دیا۔

خلافت ارضی کی تفویض پر فرشتوں نے نیابت آدم کے بارے میں ادب و نیاز کے ساتھ عرض کی تھی۔ اے اللہ تو نے اس آدم کے سر پر خلافت ارضی کا تاج رکھ دیا ہے جو اس میں فساد کرے گا اور خونریزی کرے گا اور ہم تسبیح و تقدیس کے ساتھ تیری تعریف بیان کرتے ہیں، چونکہ آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی

مشیت خاص کے ساتھ علم الاشیاء بخشا تھا۔ اور اپنی مشیت سے ہی آدم علیہ السلام کو خلافت عطا فرمائی تھی اور اُن کو خلافت کا اہل بھی بنا دیا تھا اور خلافت کے ساتھ تصرفات کرنے کی بھی صلاحیت عطا فرما دی تھی نیز اللہ تعالےٰ کے علم میں تھا کہ آدم کے سوا کوئی اور مخلوق یہ مرتبہ نہیں پا سکتی۔

چنانچہ اپنے اس فیصلے کو قطعی اور حق بجانب ثابت کرنے کے لئے اللہ تعالےٰ نے فرشتوں کے سوال کا جواب اُن کی بضاعت علمی کو ثابت کرنے کے لئے معارضہ کی صورت پیدا فرما دی اور فرشتوں کو آدم علیہ السلام کے علم خداداد کے مقابلے کا امتحانی پرچہ دے دیا اور فرمایا اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو جملہ اشیاء عالمین کے نام بتا دو۔ اُس امتحانی پرچہ پر سب فرشتے ورطہ حیرت میں مبتلا ہو کر تعجب انگیز حالت میں بول اُٹھے کہ سب پاکیزگیاں تیرے لئے ہیں۔ ہمارے پاس علم نہیں مگر اتنا جتنا تو نے ہم کو عطا فرمایا ہے۔ اے اللہ تو جاننے والا حکیم مطلق ہے۔

اس امتحان نے اللہ تعالےٰ کے قطعی فیصلے کو حق ثابت کر دیا اور فرشتے آدم علیہ السلام کے علم کے سامنے فیل ہو گئے۔ یعنی کہ آدم علیہ السلام کے سوا کوئی مخلوق بھی زمین پر کماحقہٗ حکمرانی کے فرائض انجام نہیں دے سکتی۔

حضرت آدم علیہ السلام کی نیابت علمی سے لے کر فخر موجودات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ خلق عظیم تک اور نبی پاک صاحب لولاک کی بعثت مبارک سے لے کر آپ کے وصال مبارک تک خلافت کبریٰ انسانیہ کا ہی عملاً اور علماً ترجمہ ہوتا رہا۔ اس اجمالی تمہید کا منشا مسلمانان عالم کی طبائع کو قرآن مجید کی اس مجموعی دعوت کی طرف مائل کر کے اُن خطوط پر چلانا مقصود ہے جن کی تجویز قرآن مجید پیش کرتا ہے۔ قرآن مجید اپنے ہمہ گیر نظریۂ حیات کو بڑے ہی حسین و جمیل انداز میں پیش کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً۔

اے ایمان والو تم اسلام میں پورے پورے طریقوں کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔

قرآن مجید اس امر ذی شان کے مطابق مسلمانوں کو جزوی و کلی احکام کے ساتھ اجتماعی طور پر ہمہ گیری عمل کا شعور حاصل کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

قرآن مجید کی تعلیمات کی دو ہی افادی صورتیں ہیں، ایک اس کی تلاوت سمجھ کر پڑھنے کا ثواب، دوم اس کے احکامات کو عملی جامہ پہنا کر روحانی اور مادی فتوحات حاصل کرنا ہے۔ گویا قرآن مجید اپنے پیروکاروں کیلئے فلاح دارین کا ضامن ہے۔

عقائد اسلامیہ کے بعد اسلامی عمل کی تشکیل تاریخ عمل کی صورت میں مرتب ہو کر سامنے آتی ہے۔ قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے فطرت کی اُن سبیلوں پر نظر رکھنا ضروری ہے جو صرف انسانوں کی بہبود کے لئے بنائی گئی ہیں اور وہ انسانیت کے فائدوں کے لئے ایک قدرتی سامان کی حیثیت رکھتی ہیں جن کا حصول انسان کے لئے ضروری ہے جو چیزیں جسم وجان انسان اور اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لوازم ضروریہ میں داخل ہوں جن سے انسانی معاشرہ کسی طرح بھی الگ نہیں ہو سکتا۔ اُن پر نظر رکھتے ہوئے مزید معلومات حاصل کرنے سے انسانیت کی خدمت کے ساتھ ساتھ معلومات کا بھی اضافہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید اپنی تعلیمات کو آیات کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ پھر مطالعہ کی دعوت دیتا ہے تاکہ انسان گوشۂ عالم کی معنی خیز آیات کا بھی مطالعہ کر سکے اور اس مطالعہ کے بعد اُن آیات کو اپنے تصرف میں لا سکے۔ پھر اُن کے لاتعداد منافعوں سے خود بھی بہرہ ور ہو سکے اور لوگوں کو بھی اُن کے فائدوں سے مالا مال کر سکے۔

قرآن مجید کائنات کا صرف سرسری جائزہ و مطالعہ کرنے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ ہر اس طور و طریقہ سے مطالعہ کرنے کی ترغیب دیتا ہے جس سے حقیقت کائنات کے مخفی گوشے انسانیت پر واضح ہو کر اسے مزید معلومات حاصل کرنے کی دعوت دیں۔ یہ مطالعہ ژرف نگاہی کے ساتھ تشریح کائنات چاہتا ہے سب آیات چاہے آفاقی ہوں چاہے قرآنی اللہ کی بڑائی اس کی مہربانیوں کے ساتھ بیان کرتی ہیں یا ظاہر کرتی ہیں۔ یہ سب آیات نظام کائنات میں انسانیت کے لئے حکم خداوندی کے ساتھ بروئے کار ہیں۔

اس صفحۂ ہستی پر اُن آیات یا اشیاء کا بروئے کار ہونا سراسر انسانی منفعت کے لئے ہے اور انسان ان سے اُسی حالت میں استفادہ کر سکتا ہے جب وہ سنجیدگی عقل اور صحت مندانہ فکر کے ساتھ ان کا مطالعہ کرے۔ مطالعۂ کائنات صحیح معنوں میں نہ کرنے کی حالت میں انسانی معاشرہ تحقیقات کی راہوں سے غافل ہو کر منافعوں سے بھی بے بہرہ ہونے کے ساتھ ساتھ مساہلہ پسند ہو جاتا ہے۔

مساہلہ انسانی معاشرے کے اس تساہل اور تکاسل کا نام ہے جو عملی زندگی سے جان چرا کر مشقت سے دل برداشتہ ہو کر تن آسانی کی راہیں تلاش کرے۔ یہی مساہلہ کچھ مدت کے بعد علوم و فنون کی اُن اصطلاحات میں بھی غلط قسم کی اور من گھڑت تاویلات کرنی شروع کر دیتا ہے جو انسانی زندگی کے ہر گوشۂ حیات میں ارتقائی حیثیات کی حامل ہوتی ہیں۔

جب یہ مساہلہ علماء و مفکرین وقت کے اذہان و قلوب پر مسلط ہو جاتا ہے تو ہر اُس عملی اور علمی اصطلاح میں تبدل و تغیر رونما ہونا شروع ہو جاتا ہے جو انسان کو محنت شاقہ کے ساتھ منزل مقصود کی طرف دعوت دینے کے لئے

بنائی جاتی ہیں۔

یہی حال اسلام سے پہلی اُمتوں کے ساتھ ہوا۔ اُن اُمتوں کے سہل پسند علما و محققین نے تن آسانی پانے کے لئے خدا کی اُن متعینہ اصطلاحات میں تراجم کرنی شروع کر دیں جن پر علوم و فنون کی تعمیر و ترقی ہو سکتی تھی۔ دنیا کے وہ حیران کر دینے والے ترقی پسند عوامل جو انسان کو محنت شاقہ سے میسر آ سکتے تھے اُن کو عامتہ الناس کی آنکھوں سے پوشیدہ رکھنے کے لئے ان تن آسان لوگوں نے کہیں رہبانیت اور کہیں کاہنیت اور کہیں سادھویت کی صورت میں ترک دنیا کے ساتھ ایسے ایسے توہمات کی بنائیں ڈالیں جن کی سرے سے کوئی اصل نہ تھی۔ ایسے تن آسان لوگوں نے اپنی قوموں کو اور اپنے وقت کے لوگوں کو بجائے عمل صالح حاصل کرنے کے منحوس قسم کے اوہام میں مبتلا کر دیا۔ اس قسم کی بے بنیاد دلچسپیوں نے پہلی اُمتوں کو ضروری اعمال سے بیگانہ بنا کر مفلوج العقل، مفلوج الفکر اور مفلوج العمل بنا کر اہل ہمت اور اہل محنت و مشقت سے الگ کر کے رکھ دیا۔

قرآن مجید نے اپنے نزول کے ساتھ اور اپنے لانے والے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان فیض ترجمان کے ساتھ انسانیت کو صالح العمل ہونے کی دعوت دی۔ عمل پیہم کی دعوت دے کر اس پر فلاح دارین کا دروازہ کھول دیا اور اہل ایمان مشقت گزاروں کو اس طرح بشارت سنائی۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْكُمْ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ ۰

اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے نیک عمل کرنے والے اہل ایمان کو خلافت ارضی کی بشارت دی اور دوسری متعدد جگہوں پر بے عمل جدوجہد سے محروم لوگوں کو دنیا و عقبےٰ کی الم ناکیوں کی تنذیر سنائی۔

قرآن مجید نے جہاں جہاں عقیدۂ توحید، عقیدۂ رسالت اور عقیدہ آخرت کی تعلیم دی، وہاں اُس نے اس کائنات کو اور اس کی جملہ اشیاء کو نعمتِ خداوندی قرار دیا اور نعمت کا شکرانہ ادا کرنے کی تعلیم دی۔

جن جن نعمتوں کا شکریہ ادا کرنے کا حکم دیا جاتا ہے وہ سب کے سب عالم اسباب سے متعلق ہیں۔ اور عالم اسباب غیر اللہ ہے۔ اللہ تعالےٰ سبب نہیں بلکہ مسبب الاسباب ہے۔ چونکہ سبب پر علت کا اطلاق ہوتا ہے۔ کامل عارفوں نے فرمایا ہے کہ علت نقص ہے اور اللہ تعالےٰ کی ذات نقائص سے پاک ہے خداوند ذوالجلال علت نہیں بلکہ معلِّل ہے، وہ سبب نہیں بلکہ مسبب ہے۔ وہ نعمت نہیں بلکہ منعم ہے۔ اور قرآن مجید نے انعامات کو خدا کی بخشش سے تعبیر فرمایا اور مُنعَمٌ مِنَ اللہِ لوگوں کو انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین سے تعبیر فرمایا۔ سورۃ فاتحہ میں اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ تو نے جن پر بخشش فرمائی۔ اُن کا ذکر قرآن مجید میں دوسری جگہ یوں بیان فرمایا: اُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝

سورۃ النساء کے انعام یافتہ لوگ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے ان لوگوں کی رفاقت کو تعجب انگیز طور پر بہت نیک ثابت فرمایا یعنی کس قدر باوفا دوست ہیں۔ سورۃ الرحمٰن ساری کی ساری کائنات اور اس کی مختلف چیزوں کی اور مختلف گوشوں کی صحیح ترجمانی کرتے ہوئے قبولیت حق کی دعوت دیتی ہے۔ تکذیب خداوندی، تکذیب احکامات خداوندی اور تکذیب بعثت انبیاء، تکذیب اولیاء اور تکذیب قیامت سے اور تکذیب جزا وسزا سے منع کرتی ہے۔ اس لئے کہ گوشۂ عالم ساری انسانیت کے لئے دسترخوانِ نعمت ہونے کے ساتھ مشارٌالیہ کا کام بھی دیتا ہے۔ یعنی کل کائنات اور اس کی ہر چیز اپنے بنانے

والے کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ وہی ہے جس نے مجھے فلاں فلاں صفات کے ساتھ پیدا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے مشارق و مغارب پر پھیلی ہوئی سطح ارضی کو بنی نوع انسان کے لئے ایک خوانِ نعمت بنا دیا ہے۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ہ یعنی تم کسی پہلو سے بھی اللہ کی ذات واجب الوجود کو جھٹلا نہیں سکتے۔

یہ دنیا وہ خوانِ یغما ہے جس پر انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے فرائض انجام دیئے۔ اور اس کی گوناگوں نعمتوں سے کما حقہٗ استفادہ کیا۔ اور اس نعمت کا شکرانہ تحیات لسانی، تحیات بدنی اور تحیات مالی کی صورت میں ادا کیا

قرآن مجید نے عالم اسباب سے روگردانی کو کفران نعمت قرار دیا۔ قرآن مجید کی یہی تبلیغ تھی جس نے صورت اسلام کے ساتھ صورت رہبانیت، صورت کاہنیت اور صورت سادھو ہئیت کی ہمیشہ کے لئے بیخ کنی فرما دی اور ان لایعنی باتوں کے ردّ کے لئے ایسے فقر و غنا کی بنیاد ڈالی جس نے ماسواء اللہ کی پرستش سے مطلقاً الگ ہو کر مطلقاً صرف اور صرف اپنے معبود برحق کی خالص عبادت کے لئے اپنے آپ کو مختص اور وقف کر دیا اور لومۃ لائم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ہمہ گیر میدانِ عمل میں کود پڑے اور اس میدان حق میں کود جانے کی دعوت عام دی۔ اور اپنے پیروکاروں کو کہیں حیدر کرارؓ کی صورت میں کہیں ابوبکرؓ و عمرؓ کی صورت میں کہیں عثمان غنیؓ کی صورت میں کہیں بلال حبشیؓ کی صورت میں۔ کہیں خالد بن ولید کی صورت میں اور کہیں عساکر اسلامی کی صورت میں دعوت حق کے لئے آمادہ کار فرمایا دنیا اہل ایمان کے لئے مَزْرَعُ الْاٰخِرَۃ بنا دی گئی ہے۔ یہ اسلام ہی کا نظریہ ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ یہاں جو کچھ بویا جائے گا قیامت کے دن وہی کاٹا جائے گا۔ اس حدیث شریف کا صحیح ترجمہ یہ ہے۔

از مکافاتِ عمل غافل مشو ۔ گندم از گندم بروید جو ز جو

اے سالک راہ حقیقت یا اے مسلمان یا اے انسان اپنے انجام کار سے غفلت نہ کرو بلکہ اس کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھو۔ عمل کے جو بیج اس دنیا میں بوؤ گے آخرت میں اسی کو کاٹو گے۔ اگر مسلمان اعمال صالحہ کے ساتھ دنیا میں حسین ترین تہذیب و تمدن کی بنائیں نہیں ڈالیں گے تو وہ راحت عقبیٰ کی سعادتوں سے بہرہ ور نہیں ہو سکیں گے۔ قرآن مجید کی تعلیم محنت و اجتہاد کے ساتھ اپنے پیروکاروں کو مزید معلومات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ فلاح و نجات سے ہمکنار کرنا چاہتی ہے۔

ارشاد باری تعالےٰ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝

یعنی جن لوگوں نے ہمارے دین کی راہ میں مجاہدانہ کوششیں کیں ہم اُن پر بہت سارے ہدایت کے راستے کھول دیں گے یعنی اُن پر دین کی باریکیاں واضح کر دیں گے۔ قرآن مجید کی تعلیم مجموعی حیثیت عملیہ کی آخری ترجمان ہے۔ جو لوگوں کی سعیٔ بلیغ پر روشنی ڈالتی ہے۔ جو لوگ اللہ تعالےٰ کے راستے میں جہد مسلسل کرتے ہیں، اور اپنی امکانی صلاحیتوں کے ساتھ راہ راست پر یعنی دین کے راستہ پر چلتے ہیں اور کوشش پیہم کے ساتھ اللہ تعالےٰ کی خوشنودی حاصل کرتے ہیں جس پر وہ بخشش کے انعامات پاتے ہیں اور مزید جستجو کے لئے معلومات حاصل کرنے کی راہیں ہموار کرتے رہتے ہیں۔

اس آیت میں بلیغ عمل اور بلیغ کوششوں سے بلیغ تجسس کرنے والوں کو محسنین کے نام سے موسوم فرمایا گیا اور اللہ تعالےٰ نے لام تاکید کے ساتھ اپنی معیت ان کے لئے ثابت فرمائی۔ یعنی یقیناً اللہ تعالےٰ ایسے محنت کوش لوگوں کے ساتھ ہے آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے یعنی جو لوگ ہماری راہ میں مصروف عمل ہوئے اور سیدھی راہ پر چلنے کی کوشش کی ہم اُن پر ہدایت کی باریکیاں واضح کریں گے اور اللہ محسنین کے ساتھ ہے اور وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فرما کر اہل کوشش کی تخصیص

فرمائی۔ فِیْنَا فرما کر دین اسلام کی راہ پر چلنے کی فضیلت کا اظہار فرمایا۔
لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا فرما کر جہد مسلسل کی جزا کا اس طرح ذکر فرمایا کہ ایسا جہاد کرنے والوں پر ہم مزید درمزید انکشافات کریں گے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ o فرما کر اپنی معیت کی بشارت دی گئی ہے۔ یہ معیت خوشنودئ رب کا نتیجہ ہے

قرآن مجید کی تعلیمات اپنے پیروکاروں کے لئے عمل پیہم کے ساتھ خوشنودئ رب چاہتی ہے۔ قرآن مجید کی برحق تعلیمات غیر مسلمین کے بطلان کا رد، اہل ایمان کے نیک اقوال و افعال کے ساتھ کرنا چاہتی ہیں۔

قرآن مجید اپنے پیروکاروں کو دنیا و عقبےٰ میں نیک اعمال کے ساتھ روحانی، مادی معلومات حاصل کرنے کی ترغیب و تعلیم دیتا ہے تاکہ اس کے پیروکار معلومات کی فراوانی کے ساتھ دنیا و عقبےٰ میں پوری آسودگی حاصل کر سکیں۔ اور ایسی حیات جاودان حاصل کرنے میں کامیابی پا سکیں جہاں حیات ہی ہو اور موت پر فتح کامل مل سکے یعنی موت کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر اپنے حقیقی محبوب سے مل سکیں۔ کَمَا قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْمَوْتُ جِسْرٌ یُوْصِلُ الْحَبِیْبَ اِلَی الْحَبِیْبِ۔

یعنی موت ایک پل ہے جس پر اللہ کے حبیبوں کو گزارا جاتا ہے جو اپنے محبوب حقیقی کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ اس حدیث شریف میں موت کے پل سے گزرنے والے کو حبیب کے نام سے یاد فرمایا گیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ غیر مسلم اللہ تعالےٰ کے حبیب نہیں ہو سکتے۔ بلکہ اللہ تعالےٰ کے حبیب وہ لوگ ہیں جو اس کے بھیجے ہوئے انبیاء و مرسلین کے ذریعے بھیجے ہوئے دینوں پر ایمان لاتے ہیں اور خدا کے بھیجے ہوئے دین کی روشنی میں نیک اعمال کی بجا آوری کرتے ہیں۔ آخری نبی پاک حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے لوگ نبی پاک کے آخری دین پر ایمان لانے کے بعد پھر اسی دین کی روشنی میں عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کی بجا آوری کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے بھیجے ہوئے آخری نبی ہیں اس لئے اُن کی اُمت بھی آخری اُمت ہے اور آپ کا دین بھی آخری دین ہے۔ آپ کے بعد نہ کوئی نبی آسکتا ہے نہ کوئی دین آسکتا ہے اور نہ کوئی اُمت آسکتی ہے۔ نبی پاک کی اُمت کو خیر الامم کا لقب دیا گیا ہے۔ اور اس کی تعریف یوں فرمائی گئی۔
کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
یعنی اے مسلمانو! تم ہی تمام امتوں سے بہتر اُمت ہو اس لئے کہ تم لوگوں کو اسلام کی بتائی ہوئی نیکیوں کی طرف بلاتے ہو اور اسلام کی منع کی ہوئی برائیوں سے روکتے ہو۔

اس مذکورہ تعریف کے ساتھ اہل ایمان خدا کے حبیب بن جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو موت کے پل پر سے حبیب بنا کر گزارہ جاتا ہے۔ اور یہی لوگ اپنے محبوب حقیقی سے وصل فرماتے ہیں۔ گویا یہ لوگ موت کی آنکھ سے آنکھ ملا کر اولیاء اللہ کی صورت میں وصال کرتے ہیں۔

قرآن مجید کی تعلیمات اپنے پیروکاروں کو لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ کا مصداق بنانا چاہتی ہیں یعنی اُن کا اپنے خدا پر اتنا کامل یقین ہوتا ہے اور اتنا زیادہ بھروسہ ہوتا ہے کہ وہ غیر اللہ سے کبھی اور کسی حالت میں بھی خوف نہیں کھاتے۔ اس دنیا میں بھی وہ اپنے ایمان کی بدولت ماسوا اللہ سے بے خوف رہتے ہیں اور میدانِ حشر میں بھی وہ اللہ تعالےٰ کی نگاہوں میں محبوب ہونے کی بدولت بے غم ہوں گے۔

قرآن مجید کی تعلیمات عمل پیہم کے ساتھ اپنے پیروکاروں کو خوشنودیٔ رب حاصل کرنے کی تعلیم دیتی ہیں۔ قرآن مجید کی تعلیمات پر صحیح معنوں میں عمل پیرا ہو کر مسلمان قوم غیر مسلمین پر کما حقہٗ سبقت لے جاتی ہے۔ قرآن مجید اپنے پیروکاروں کو

بہر طور اللہ تعالےٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے کہ خدا ئے تعالیٰ ہی نظام تخلیق نظام کائنات، نظام موت اور نظام قیامت کا مالک ہے، قرآن مجید کا نظریہ توحید نظریہ رسالت اور نظریہ جزاء و سزا ایک ایسا بلیغ نظریہ حیات ہے جو عقل و دل و نگاہ کو فطری ضابطوں کے ساتھ مربوط کردیتا ہے جسے عالم خارج کے حوادث متزلزل نہیں کر سکتے۔ اور روح انسانی کو استحکام مل جاتا ہے تاکہ وہ پوری قوت کے ساتھ جسم خاکی کو اور اس کے جملہ اجزا کو ایک ہی لازوال مقصد کی طرف بڑھنے کے لئے پوری طرح متحرک کر سکے اور اس کا رونگٹا رونگٹا یاد الٰہی میں مصروف و مشغول ہو جائے۔ میدان رزم ہو یا میدان بزم وہ ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کی خالص بندگی حاصل کر سکے۔ اس طرح روح و جسم کے ارتباط سے نظریہ توحید و رسالت اور نظریہ آخرت کو تقویت ملتی ہے۔

جسم کی عادت ہے کہ جو نظریہ بھی اس پر غالب آجائے وہ اسی کا مطیع و منقاد ہو جاتا ہے۔ اگر مادی نظریہ حیات اس پر غالب آجائے تو وہ مادیت پرست ہو جاتا ہے اور اگر روحانی نظریہ حیات اس پر مسلط ہو جائے تو وہ مطلقاً دنیا سے الگ ہو کر روحانیت پرست ہو جاتا ہے اور یہ دونوں حالتیں قرآن مجید کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔ مادیت پرست صرف دنیوی آسودگی چاہتے ہیں جس میں روحانیت کا شائبہ تک نہیں ہوتا اور وہ ہوا و ہوس کے بندے ہو کر مطلق العنان ہو جاتے ہیں۔ اگر طاقت و زر ہو جائیں یا حکومت وغیرہ مل جائے تو وہ فرعون بن جاتے ہیں، جیسا کہ فرعون، نمرود، ہامان و شداد اور ابوجہل وغیرہ مطلق العنان ہو گئے تھے فراعنہ قسم کے لوگ تو خدا ہونے کا دعوےٰ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے، پس قرآن مجید کی تعلیمات اپنے پیروکاروں کو مطلقاً مادہ پرست ہونے سے بشدت روکتی ہیں اور ایسی روحانیت سے بھی روکتی ہیں جس میں ایسی حالت کارفرما ہو کہ وہ دنیا کے علائق

توڑ کر حقوق العباد کو یکسر چھوڑ کر جنگلوں اور غاروں وغیرہ میں چھپ کر روحانی آسودگی حاصل کریں وہ ایسے روحانی اور مادی تعیش کی مخالفت کرتا ہے

وہ ایسی روحانیت سے جو عیسائی راہبوں اور یہودی کاہنوں اور ہندومت کے سادھوؤں کا روپ دھار لے خارج از اسلام قرار دیتا ہے۔

بلسانِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح فیصلہ صادر ہوتا ہے :-
لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ یعنی اسلام میں اس قسم کی رہبانیت اور کاہنیت اور سادھویت کی مطلقاً گنجائش نہیں۔

قرآن مجید اصول فطرت کے مطابق اس قسم کی تعلیم دیتا ہے جس کی بنا سچائیوں پر ہو۔ یہ بھی قرآن مجید کی ایک معجزانہ حیثیت ہے وہ جسم خاکی کو کسی ایسی تحریص پر آمادہ کار نہیں کرتا جس میں غیر فطری کذب کا شائبہ تک بھی موجود ہو۔ قرآن مجید کا مقصد تعلیم اعمال انسانیہ کو سچائیوں پر استوار کرتا ہے تاکہ وہ پہلے خیال سے لے کر انتہائے کمال تک فطری صداقتوں اور فطری سعادتوں کا ہی مظاہرہ کر سکے ان حقیقی تعلیمات سے میدانِ عمل میں قرآن مجید سے پیروکاروں کو حسن باطن اور حسنِ طمانیت جیسے صفات پاک ملتے ہیں جن سے وہ اپنی زندگی اور موت دونوں کو اللہ تعالےٰ کی راہ میں وقف کرنے کے بعد معراج ایمان حاصل کر لیتا ہے اور اپنی تمام تر کوششوں کو للہ تعالےٰ بروئے کار لاتا ہے۔ وہ اپنے جسم خاکی کے ساتھ ہمہ تن مصروف عبادت ہو کر خالص بندگی کے ساتھ رضا رحق چاہتا ہے۔ یہ وہ بنیادی نکتۂ ایمان و ایقان ہے جس کو وہ اپنی نیک نیتی کے ساتھ روح کے جہانوں سے اٹھتا ہوا اپنے احساسات و افکار و تخیلات کے عساکر کو ہمراہ لیتا ہوا کامیاب سعی و عمل کے میدانوں سے گزرتا ہوا موت کی آنکھ میں اپنی جاہدانہ آنکھ ڈالتا ہوا فدائیانہ انداز میں مطلوبِ حقیقی سے واصل ہوتا ہے۔

جب انسانی کوششیں ایمان با اللہ کی اس نہج تک پہنچ جائیں تو گوشۂ فطرت کی وہ کون سی چیز ہوگی جو اس کا ساتھ نہ دے۔ اس مذکورہ آیت میں اہل ایمان کی جملہ کوششوں کو راہ راست پہ محمول کیا گیا ہے جو بر سبیل اسلام ان خفیہ جہتوں کو تلاش کرے جو اب تک انسانی نگاہوں سے پوشیدہ تھیں۔

تمیزِ حق و باطل کے لئے بھی ضروری تھا کہ انسانیت ایسے معلومات کے ساتھ کارگاہ حیات میں اپنے لئے ایسے اعمال کا تعین کرے جو انسان کو انانیت نفسانی سے بچاتی ہوئی نوعِ انسانیت سے حسن مروت کر سکے۔

عقیدہ توحید و رسالت اور عقیدۂ یوم آخرت سے ہٹ کر کوئی طبیعت انسانیہ انانیتِ ذاتی سے بچ نہیں سکتی۔ چونکہ انانیت نفسانیہ کی موجودگی میں علوم اور معلومات انسانیہ بھی جارحیت سے نجات نہیں پا سکتے۔ اسلام کی فطری تعلیمات ایسے مضر حالات و معلومات سے منع کرتی ہیں تاکہ انسان اپنی ہیبت انگیز معلومات کے ساتھ انسانیت کے لئے ہلاکت آفرین نہ بن سکے۔

وہ ابتدا سے ہی اپنی پیروی کرنے والوں کی طبیعت کو ایسے محفوظ و مامون نظریات پہ استوار کرتا ہے جن کی ضربِ اول سے ہی انانیت نفسانیہ کو پاش پاش کر دیا جاتا ہے تاکہ ہر پیروکارِ اسلام قرآنی نظریات کے تابع اپنی ایمانی انسانی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر میدان جستجو اور میدان عمل .... پر چلنے کے لئے ہدایت کے لاتعداد گوشوں کو راہ راست پر چلنے کے لئے واضح سے بھی واضح کر سکے اور اس طرح وہ خوشنودیٔ رب حاصل کرنے کی راہیں کھولنے میں کامیاب ہو سکے۔ یہ وہ فطری طریقہ کار ہے جس پر آنے والی نسلوں کو بھی چلایا جا سکتا ہے۔

اگر انسان اپنی معلومات کے ساتھ غلبۂ حق کے لئے عدل و انصاف کو بروئے کار نہ لا سکے تو قرآن مجید کے فطری فیصلوں کے سامنے اس کے سارے اعمال برباد

ہوجاتے ہیں۔ پھر اسے بندۂ حق بننے کا بھی شرف نصیب نہیں ہو سکتا۔ تب اس کی جملہ صلاحیتیں عنداللہ لاحاصل ہو کر رہ جاتی ہیں اور خدائے تعالیٰ نے فرما دیا ہے کہ جو لوگ اس نہج ایمانی سے ہٹ کر نفس امارہ کی خواہشات کے سہاروں پر دنیا اور زینت دنیا حاصل کرنا چاہتے ہیں ہم ان کو ان کے اعمال کا بدلہ اس دنیا میں ہی دے دیتے ہیں مگر انجام کار سوائے آتش جہنم کے ان کے لئے اور کچھ بھی نہیں ہے اور جو کچھ انہوں نے دنیا میں دینا لینا کیا تھا وہ سب کا سب باطل و برباد ہو گیا۔

قرآن مجید اصول فطرت پر اس قسم کی تعلیم دیتا ہے جس کی بنا مطلقاً سچائیوں پر ہو قرآن مجید کی یہ فطری تعلیم ہی اس کی معجزانہ حیثیت کی حامل ہے۔ وہ انسان کے جسم خاکی کو یا اس کی خواہشات کو کسی ایسی تحریص کے ساتھ آمادۂ عمل نہیں کرتا جس میں غیر فطری کذب و دجل کا شائبہ تک بھی موجود ہو۔ قرآن مجید کا مقصد تعلیم ہی اعمالِ انسانیہ کو صداقتوں اور شرافتوں پر استوار کرنا ہے تاکہ وہ خیال اور لے سے لے کر انتہائے کمال تک خدا کی حقیقتوں کا اظہار کر سکے اور اپنے ماننے والوں کو مُتَخَلِّقْ باخلاقِ باللہ کر سکے۔ ان تعلیمات کے نتیجہ میں اس کے پیرو کاروں کو سراسر حسن باطن اور حسنِ طمانیت میسر آتا ہے۔

وہ اپنی ساری زندگی اور اس کے سارے لوازمات کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں وقف کر دینے کو ہی اپنے لئے معراج کمال گردانتا ہے۔ وہ اپنے ظاہر و باطن کے ساتھ ہمہ تن مصروف رضائے الٰہی ہو جاتا ہے۔

یہ وہ نقطۂ معراج ہے جس پر اللہ تعالیٰ اس پر راضی ہو جاتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ پر راضی برضا ہو جاتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ۔ یعنی اللہ تعالیٰ اُن سے راضی ہو جاتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ بنیادی نکتۂ ایمان ہے جس سے وہ اپنی نیک نیتی سے روح کے جہانوں سے اٹھتا

ہوا احساسات و افکار و تخیلات کے لشکروں کو اپنے ہمراہ لیتا ہوا کامیاب ترین سعی و عمل کے میدانوں سے گزرتا ہوا موت کی آنکھ میں آنکھ ڈالتا ہوا والہانہ اندازِ اسلام کے ساتھ اپنے مطلوب حقیقی سے واصل ہو جاتا ہے۔

جب کوشش ایمانیات کا یہ مقام بلند حاصل کر لے تو گوشۂ فطرت کی وہ کون سی چیز ہے جو اس پر عیاں نہ ہو اور اس کا ساتھ نہ دے۔ اس آیت میں اہل ایمان کی کوششوں کو راہ راست پر محمول کیا گیا ہے جو بر سبیل اسلام چل کر ان جملہ سبیلوں کو پا لیتی ہیں جو انسانی ظاہری ہنگاموں سے پوشیدہ ہوتی ہیں۔ تمیز حق و باطل کے لئے بھی ضروری تھا کہ انسانیت ایسے ہمہ گیر آئین فطرت کے ساتھ کارگاہ حیات میں اپنے لئے ایسے اعمال کا تعین کر سکے جو انانیت نفس سے بچاتی ہوئی انسانیت کے ساتھ حسن مروت کا ایسا سلوک کرے کہ انسانیت اپنے آپ کو راہِ راست پر چلانے کے لئے مجبور ہو جائے۔

عقیدۂ توحید، عقیدۂ رسالت اور عقیدۂ آخرت سے ہٹ کر کوئی طبیعت انسانیہ عجب ذاتی اور تکبر ذاتی سے بچ نہیں سکتی۔ یہ وہ مخدوش حالت زار ہے جس پر پہنچ کر انسان اپنے حاصل شدہ معلومات کو دوسرے انسانوں کے لئے جارحانہ شکل دے دیتا ہے۔ اسلام ایسے محصولات و معلومات سے منع کرتا ہے کہ کہیں انسانیت اپنی ہیبت انگیز معلومات کے ساتھ بنی نوع انسان کے لئے بجائے عافیت کے ہلاکت آفرین نہ ہو جائے۔

قرآن مجید کا اسلام سرے سے ہی اپنے ماننے والوں کو ایسے نظریات پر استوار کرتا ہے جن کی ضرب اول سے ہی غرور نفس کے خفی و جلی بت پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ اس سے پیروکار اسلام قرآنی نظریات کے تابع اپنی ایمانی اسلامی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر میدان عمل میں علوم اسلامیہ کے ساتھ حیرت انگیز فنون

حاصل کرنے کے لئے ہدایت کے لاتعداد گوشوں کو اپنے طالب علموں پر واضح سے واضح تر کر دیتا ہے اور خوف الہٰی سے حاصل شدہ علوم و فنون کو خوشنودئ رب کے لئے پوری انسانیت کی فلاح و نجات کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ اگر قرآن کا طالب علم اپنی معلومات کو غلبۂ حق و انصاف کے لئے بروئے کار نہ لا سکے تو خدا کے فیصلوں کے مطابق اس کے سارے اعمال فرعونی سنت پر چل کر ہمیشہ کیلئے برباد ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ بندۂ حق نہیں رہتا بلکہ بندۂ نفس اور بندۂ دنیا بن جاتا ہے۔

جب وہ بندہ نفس بن جاتا ہے تو انسانی بلندیوں سے اسے نفس کی پستیوں ..... میں گرا دیا جاتا ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۔ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ سے یہی مراد ہے کہ ہم نے انسان کو روحانی و مادی طور پر احسن ترین تقویم کے ساتھ پیدا فرمایا تھا تاکہ وہ اخلاقیات کی اعلیٰ ترین بلندیوں پر پہنچ کر انسانی معراج کمال کا لوہا منوا سکے مگر وہ تو اس کے خلاف پست خیالیوں کا شکار ہو کر بالکل ہی ایسی پستیوں میں گر گیا جو حیوانیت سے بھی بدتر ہیں۔ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ = فرما کر نیک عمل کرنے والے اہل ایمان کو ایسی حیوانیت اور ایسی پستیوں میں گرنے والوں سے مستثنیٰ قرار دیا اور ان کے لئے بے حساب اجر و ثواب کی بشارت سنائی اور فرمایا جو لوگ اس مقام بلند سے ہٹ کر نفس کے سہاروں پر دنیا اور لذات دنیا چاہتے ہیں اور مصنوعی زیب و زینت کے طلبگار ہیں۔ ہم ان کو دنیا کی عزت و آبرو اور دنیا کی زیب و زینت دے دیتے ہیں مگر انجام کار ان لوگوں کے لئے عذاب ہی عذاب ہے۔

یعنی دنیا میں غیر مطمئن ہوں گے اور آخرت کی سعادتوں سے محروم ہو جائیں گے۔ قرآن مجید ایسے دنیا پرستوں کے انجام کی اس طرح نقشہ کشی کرتا ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ٥ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ط

یعنی جو لوگ صرف عیش دنیا کے لئے اور اس کی عارضی زیب و زینت حاصل کرنے کا ارادہ کرتے ہیں یا خواہش رکھتے ہیں ہم اُن کو ان کے اعمال کا بدلہ اسی دنیا میں دے دیتے ہیں مگر انجام کار ان کے لئے عذاب ہی عذاب ہے اور ان کے مصنوعی اعمال سب کے سب برباد ہو جاتے ہیں۔ چونکہ ایسا مال و منال اور ایسی زیب و زینت خوفِ خدا سے خالی ہونے کی وجہ سے جارحانہ اور غاصبانہ صورت اختیار کر لیتے ہیں مگر اسلامی تعلیمات نے اس کے بدل میں وصول دنیا کی تعلیم خوف ربانی کے ساتھ دی ہے۔

قرآن مجید اسلام اور ریاستِ اسلام کو نور و تمثال کی حیثیت دیتا ہے تاکہ مسلمان اسلام کی صداقتوں کی روشنی میں حصول کائنات کے ساتھ غلبۂ حق کا اظہار کر سکیں مظلوموں کو پنجۂ ظلم سے چھوڑانے کے لئے وہ طاقت کو استعمال کرنے کا حکم دیتا ہے اور ظالم کو عبرتناک سزا دے کر ظلم و عدوان کے دروازے بند کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

صورت انصاف اگرچہ بظاہر سخت ہوتی ہے مگر اس میں جارحیت نہیں ہوتی بلکہ غلبۂ اسلام کے ساتھ اہلِ حق کی حق رسی کا صحیح انتظام کیا جاتا ہے۔ اسلام کا یہ ایک عادلانہ طریقہ ہے اور دفاع میں سالمیت ملک کے لئے متاع زندگانی کو بروئے کار لانے کی طرف آمادہ کرتا ہے۔ اس دفاع میں مسلمانوں کو پہل کرنے کی اجازت نہیں ہوتی اور نہ جامعیت اسلام کو برقرار رکھنے کے لئے دفاع کا حکم دیا جاتا ہے محض دفاع برائے دفاع کی اسلام میں اجازت نہیں۔ اس کے دفاع میں حصول کائنات اور تسخیر کائنات کا بھی سراغ ملتا ہے۔

دین اسلام وہ نور ہے جو عقیدت کے ساتھ عالم اسباب کو ہمراہ لے کر راہ راست پر چلنے میں ممد سفر ہوتا ہے۔ منزل زیست پر ضروریات زندگانی کے جتنے زیادہ سامان ہوں گے منزلیں اتنی ہی زیادہ آسان ہوں گی۔

قرآن مجید اپنے پیروکاروں کو زمین پر بکھرے ہوئے لاتعداد ذروں کے مطالعہ کی اس طرح دعوت دیتا ہے کہ تم زمین پر اتنے بے فکر ہو کر نہ چلو کہ تمہارے پاؤں کے نیچے آیات الٰہی پامال ہو جائیں اور ارض و سما کی وسعتوں اور پنہائیوں پر غور و خوض کرنے کی دعوت محض اس واسطے دیتا ہے کہ تم ان پر تصرف حاصل کرسکو اور متاع زیست کے خفی و جلی خزائن کو حاصل کرسکو۔ اور یہ کہ اللہ تعالےٰ کی حاکمیت مطلقہ پر اپنا ایمان مضبوط و مستحکم کرسکو۔ ہر مطالعہ کا مقصود حصول شئی ہوتا ہے محض مطالعہ برائے مطالعہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

اسلام میں مطالعہ سے مراد یہ ہے کہ تم اپنی فکری صلاحیتوں کے ساتھ تحقیق و تدقیق کے میدانوں میں سعیٔ بلیغ کے ساتھ آگے بڑھ کر مزید معلومات حاصل کرسکو۔ سُبُلَنَا کے معنی بہت سی راہیں ہیں۔ وہ بہت سی راہیں دینی معلومات کے ساتھ دنیا کی راہیں بھی ہیں۔ اور بہت سارے علوم اور بہت سارے فنون ہیں جن کے حاصل کر لینے سے مسلمان احتیاج غیر اللہ سے بچ نکلتے ہیں۔ چونکہ احتیاج میں ایمان کے ضعیف ہونے کا غالب اندیشہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی تعلیمات بہر کیف اپنے ماننے والوں میں احتیاج سے بچنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہیں پس مسلمانوں کے لئے ہر وقت ضروری ہے کہ وہ دینی تعلیمات کو اپناتے ہوئے حکمت کے میدانوں میں کامل دستگاہ حاصل کرتے ہوئے سائنسی علوم میں بھی بکمال دسترس حاصل کرسکیں۔

اور دور جدید کے نئے تقاضوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے متحدہ طور پر

تیار ہو جائیں کہ منشاء ایزدی یہی ہے کہ اہل اسلام عالم اسباب سے کما حقہ استفادہ کرتے ہوئے احیاء دین حق کر سکیں ۔

دور حاضرہ کے جدید تقاضوں نے انسانی اذہان پر جو دباؤ ڈال رکھا ہے اس کے پیش نظر ممالک اسلامیہ کو اپنی سلامتی کے لئے قرآن مجید کی جملہ تعلیمات کے ساتھ ان احکام کی بجا آوری کے لئے اپنی توجہ کو متحدہ طور پر مرکوز کرنا ہوگا جن کے حاصل کرنے کی ذمہ داریاں مسلمانوں پر عائد ہوتی ہیں ۔ مگر ان کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کے نظریۂ امن عالم کو زیر نظر رکھنا بھی ضروری ہے ۔ اس کے لئے ہمہ گیر عقائد و نظریات اسلام کی ہیئت مجموعیہ میں ترجمانی ضروری ہو جاتی ہے جن اذہان اسلامیہ میں ایک ترقی پسند تغیر پیدا ہو سکے اور وہ انہیں آمادۂ روزگار کر سکے ۔

دنیا میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اعتصام بحبل اللہ کے حکم الٰہی کی تسلیم کے ساتھ ذات وجنس رنگ ونسل اور جغرافیائی قیود کے متعصبانہ اور ہولناک بندھنوں کو توڑ کر ایک خدا ، ایک رسولؐ ایک قبلہ اور ایک نظریہ آخرت کے ساتھ ایک ہی آئین فطرت کے تابع ہو کر اپنی اپنی ریاستوں کی داخلی حیثیات کی حفاظت کرتے ہوئے اعمال صالحہ کے ساتھ خارجی مہلکات سے بچنے کی تدبیر کریں ۔

اگر مسلمانان عالم صرف اسی نظریہ پر کاربند رہیں اور متحد ہو کر اپنے استحکام ملکی کے ساتھ اپنی ریاستوں کو مضبوط بنیادوں پر تعمیر کریں ۔ اور اپنے پاؤں اپنی حدود سے باہر نہیں پھیلائیں گے بلکہ صرف اپنے حقوق کی حفاظت کی ذمہ داریوں کو جانتے ہوئے متحدہ نشو ونما کے ساتھ ترقیات کرتے ہوئے آگے بڑھیں گے تو اس طرح یقیناً مسلمانان عالم کو کامل استحکام مل سکتا ہے اور اعتدال کے ساتھ آگے بڑھنے کی مزید راہیں مل سکتی ہیں ۔ یہ مقام حاصل کرنے کے لئے سنجیدہ غور و فکر کی

ضرورت ہے۔

غیر صحت مندانہ غور و فکر، غیر صحت مندانہ اجتماع، غیر صحت مندانہ فرضی قسم کا اتحاد، غیر صحت مندانہ تدابیر، غیر صحت مندانہ دعوت، غیر صحت مندانہ حصولِ قوت بجائے استحکام کے اجتماعی زندگی میں تلون پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں اور داخلی و خارجی حادثات کے ردعمل کے بجائے خوفناک قسم کی ہلاکتوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔ لہٰذا مسلمانانِ عالم کو بے معنی اور عبث جذبات سے بچتے ہوئے بڑی سنجیدگی کے ساتھ سوچنے اور سمجھنے کو ترجیح دینی چاہیئے اور اپنے اجتماعی حالات کو راہِ راست پر لانے کے لئے اور اپنی اجتماعی سنجیدگی کو ثابت کرنے کے لئے عالم انسانیت کے سامنے اعلےٰ ترین ثبوت دینا چاہیئے۔

پاکستان ہمیشہ عالم اسلام کے اتحاد کے لئے اور اس کی شیرازہ بندی کے لئے مخلصانہ کوششیں کرتا رہا ہے۔ میثاق استنبول وغیرہ قسم کی کوششیں پاکستان کی صحت مندانہ تدبیر منزل کا زندہ ثبوت ہیں جو اجتماعی استحکام اور ترقی کی طرف عالم اسلام کی رہنمائی کرتی ہیں۔

خداوند تعالےٰ مسلمانانِ عالم کو بر سبیل دینِ مبین متحد و منظم ہو کر پورے وسائل کے ساتھ عالم انسانیت کی رہنمائی کے لئے اور عالم انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے اور امن عالم پیدا کرنے کے لئے مواقع عطا فرمائے۔ آمین۔

قرآن مجید اور دعوتِ فکر و نظر

قرآنِ مجید فکرِ انسانیہ کو صحیح راستوں پر چلانے کا مدعی ہے اور فکرِ انسانیہ اسی وقت صحیح راستوں پر چلتی ہے جب نفس کے غلیظ ہنگاموں سے اسے فطرت کی کرشمہ سازیوں کی طرف مائل کر کے بچایا جائے۔

قرآنِ مجید کلامِ بلیغ ہے اور ہر کلام تکلّم سے متعلق ہو کر مسموع ہوتا ہے طرزِ تخاطب کی عادت ہے کہ وہ احساسِ باطنیہ سے اُبھر کر احساسِ لامسہ حِسّیہ لِسانیہ سے لمس کرتے ہوئے مخارج بن کر بصورتِ صوت تکلّم بنتا ہے اور صاحبِ خطاب قوائے جواسیس باطنیہ وظاہریہ کے رجوع سے خطاب کرتا ہے۔

متکلّم خود قوتِ متکلمہ کے ساتھ ارادوں میں شریک ہو کر خود سامع بھی ہوتا ہے اور مخاطبین کے لئے ناظر بھی ہوتا ہے مخاطبین کیلئے متکلّم بھی ہوتا ہے اور قوتِ حِسّیہ۔ بدنیہ۔ قوتِ سامعہ۔ قوتِ باصرہ اور قوتِ شامہ سب کے شریکِ حال ہو کر تقریر کرتا ہے اور یہ ساری تقریر اس کی دنیائے فکر سے اخراج کرتی ہوئی عالمِ خارج میں جاری ہوتی ہے اور مخاطبین سب کے سب اپنی فکروں پر استوار کلامِ خطیب سنتے ہیں وہی سُننا سامعین کو سمجھنے کیلئے دعوتِ فکر دیتا ہے کلامِ خداوندی۔ خدا کی زبان سے لحن و آواز بننے سے منزّہ ہے اور سامعین کو مخاطب کرنے کیلئے جبرائیل آمین کو جو ذی شعور اور ذی فکر فرشتہ نورانی ہیں کو الہاماً ذہن نشین کرایا گیا ہے یہ پہلی فکر ہے جو احساسِ باطن سے کلامِ الٰہی وصول کرنے کیلئے متوجہ ہوئی اور کلامِ الٰہی آواز میں مبدّل ہو کر سب سے پہلے غارِ حرا میں اپنے محبوب پاک حضرت محمد مصطفٰے علیہ الصّلوٰۃ والسلام کے سامنے بلند ہوتی یہ وہ فکرِ معظّم تھی جس نے نہایت بے تابی اور محبّت کے ساتھ اپنے احساساتِ ظاہریہ و باطنیہ کے ساتھ اپنے سمعِ مقدّس کو اس کلام کی جانب مرکوز کیا۔

ختمی المرتبت علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے خدا کے کلام کو بصُورتِ لحن و آواز

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ

کے کلام پاک کی صورت میں سُنا اور اس کو پڑھا۔ اُس وقت جو حالت سرورِ کائنات پر مرتب ہوئی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے من وعن اس حالت کا نقشہ اسطرح بیان فرمایا یعنی آپ پر رقّتِ عظیمہ طاری ہوئی اور آپ کا وجود کپکپانے لگا آپ نے جبرآئیلِ امین کو جواباً فرمایا مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ میں پڑھا ہوا نہیں پھر حضرت جبرآئیلِ امین نے آپؐ کو اپنے سینۂ مبارک کے ساتھ لگایا اور دوبارہ فرمایا: "اِقْرَأْ" آپؐ نے دوبارہ جواب دیا مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ سہ بارہ بھی یہی تکرار ہوا۔

اس کا مطلب یہی تھا کہ کلامِ خدا۔ خدا کا کلام ہے۔ یہ وہی پڑھ سکتا ہے میں اس کو پڑھ نہیں سکتا مگر تائیدِ خداوندی نے آپؐ کو اپنی محبت سے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے پڑھنے کی قدرت بخشی اور آپؐ نے اس کو پڑھا قرآنِ مجید کا نزول حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے قلبِ سلیم پر ہوا۔ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰہِ یعنی جبرآئیلِ امین نے اس کلام کو اللہ کے حکم سے آپؐ کے دِل پر اُتارا۔

صاف ظاہر ہے کہ فکر مظروف ہے اور دل ظرفِ فکر و بصیرت ہے ہر دعوت کا پہلا اثر فکر و بصیرت پر ہوتا ہے بعد میں بصیرت اور فکر دونوں بر سبیل ارادۂ عقل و دل و نگاہ پر اثر آتے ہیں اور قوائے ظاہریہ کے ذریعہ عالمِ خارج پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہی اثر اندازی افعالِ باطن کا نتیجہ ہوتی ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ط

"ہم نے قرآنِ مجید کو عربی جیسی فصیح و بلیغ زبان میں نازل کیا تاکہ تم اسکو سمجھ سکو۔" سمجھنے کا دارو مدار حواسِ باطن پر ہے۔ سُننے اور دیکھنے کا تعلق بصارت اور سماعتِ ظاہریہ سے ہے گویا دیکھنا اور سُننا ظاہری آلات کے ذریعے باطنی تفہیم کیلئے ہوا یہی تفہیم ہدایت کا یقینی باعث ہوتی ہے نوعِ انسانی نے جس چیز کو اپنے

مزاج پر مسلط کیا وہ افہام و تفہیم ہی کی کارستانی تھی۔

ازل کے روز پروردگارِ عالم نے صاحبِ شعور ارواح کو تفہیم کیلئے ہی مخاطب فرمایا تھا اور اسی تخاطب کے الفاظ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں اس اَلَسْتُ میں استفہامیہ خطاب ہے اور استفہام ہمیشہ فکر و نظر کی موجودگی میں ہی ادراک پاتا ہے۔

قرآنِ مجید میں جابجا احکامات اور حکایات اور رموز و اسرار بیان فرماتے ہوئے اپنے مخاطب انسان کو لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ اور لَعَلَّهُمْ يَتَدَبَّرُوْنَ فرما کر تفہیم کرائی یہ احکامات۔ یہ امثال و حکایاتِ قرآنیہ تفکر چاہتے ہیں اور تدبر چاہتے ہیں یعنی ان کے رموز و اسرار اہلِ فکر اور اہلِ تدبر کیلئے ہیں۔

اور پھر ـــــ "اُوْلِی الْاَلْبَاب" فرما کر اہل نظر کو دعوت دی پھر "اولی العلم" فرما کر اہل علم کو دعوتِ فکر و عمل دی۔ درحقیقت کوئی مدعا جامۂ تکمیل نہیں پا سکتا جب تک وہ فکر و نظر کے سامنے اجزائے تخلیل بن کر نہ آسکے گوشۂ احکامات۔ گوشۂ اشیاء۔ گوشۂ اعمال کی باریکیاں بیان کرنا صرف فکر و نظر ہی کے سپرد کیا گیا ہے۔

اگر فکر و نظر کی محل خانۂ عالم میں تشریح نہ ہوتی تو گوشۂ عالم کے رازہائے سربستہ کبھی بھی انسانیت پر فاش نہ ہو سکتے نظر کا کام صورتوں کا صحیح جائزہ ہوتا ہے اور سمع کا کام صورتِ آواز کا جائزہ ہوتا ہے اور حس کا کام لمس محسوسہ کا جائزہ ہوتا ہے اور شامہ کا کام مشموم کا جائزہ ہوتا ہے اور ادراک کا کام فکر و بصیرت کے حوالے ہوتا ہے مثال کے طور پر آنکھ نے صورتِ لفظ کا صحیح جائزہ لیا مگر لفظ کے معانی صورتِ لفظ میں مستور و محجوب ہوتے ہیں جن کو ظاہری آنکھ مطلقاً نہیں دیکھ سکتی اور صورتِ لفظ کے معانی کو معلوم کرنے کیلئے علمائے معانی کو ظاہری آنکھ بند کرنی پڑتی ہے آج تک الفاظ کا ترجمہ بصارتِ ظاہریہ سے نہیں ہو سکا بلکہ جملہ تراجم الفاظ کے

اسرار ہونیکی حیثیت میں بصیرتِ فکریہ نے اخذ کئے۔

جملہ علومِ سماویہ۔ جملہ علومِ ارضیہ کے تراجم بصیرتِ فکریہ نے مہیا کئے ہر صورت مستور سیرتوں کا مجموعہ ہوتی ہے جب تک ان سیرتوں کا ادراک نہ کیا جائے حقیقتِ صورت کا سراغ نہیں مل سکتا اور صورِ مختلفہ کی سیرتوں کو جنہیں اصطلاحِ علومِ انسانیہ میں معانی کہا جاتا ہے وہ صفحۂ ہستی پر انسانی فکر کی طاقتِ زعیمہ سے تسخیر ہو کر انسانی منفعت کیلئے متاعِ انسانیت بنیں قدرتِ کاملہ نے ہمیشہ اپنا کلام حصولِ معانی کیلئے انسانوں کے سپرد فرمایا۔

چنانچہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ" کی آیت سے لیکر "وَالنَّاس" تک پروردگارِ عالم نے اپنی ذات کو منوانے کیلئے اپنی مخلوقات کے امثال بیان فرمائے اور ان کی خصوصیات پر بار بار بحث فرما کر انسانی ذہن کو جولانگاہِ فکر و نظر پر چلنے کی دعوت دی حمد باری تعالیٰ کا تعلق حامد کے ساتھ ہے اور ہر حمد محمود کیلئے ہوتی ہے یہاں محمودِ مطلق پروردگارِ عالم ہیں اور محمودِ مطلق کا حامد انسان ہے اور حمدِ حامد کیلئے محمود کی تحمید کا ذریعہ ہے۔ حامد صاحبِ شعور ہے حمد کا اظہار زبان سے ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے از خود زبان صاحبِ شعور نہیں ہوتی بلکہ شعور باطن کا ایک حصّہ ہے جس کی ترغیب پر زبان حمد بیان کرتی ہے پروردگارِ عالم اپنی حمد کیلئے اپنی صفتِ خالقیت سے گزر کر صفتِ ربوبیت کا اظہار فرما کر اپنے بندے کو شعوری طور پر حمد بیان کرنیکی تعلیم دیتا ہے۔

• رَبِّ الْعَالَمِيْنَ کا ترجمہ ہے جہانوں کو پالنے والا جس میں مخلوق کے تمام انواع و اقسام و اصناف آجاتے ہیں اور تمام انواعِ مخلوق پروردگارِ عالم کی تربیت سے مربوب کہلاتے ہیں یہ صفتِ ربوبیت صرف اللہ کے لئے مخصوص ہے سارے جہانوں کو پالنا اور تدریج سے ان کو معراجِ کمال تک پہنچانا صرف اللہ ہی کی صفت

ہو سکتی ہے یہاں شعورِ انسانیہ کو دعوتِ فکر و عمل دینے کیلئے تربیتِ عالمین کی مثال پیش کی یہ مثال اتنی طویل الذیل کثیر المعانی اور وسیع الحال ہے کہ اس کے طول و عرض اور عمق تک ہماری ظاہری آنکھیں۔ ظاہری کان۔ ظاہری ہاتھ کسی طرح بھی نہیں پہنچ سکتے ان کی وسعتوں تک صرفِ فکرِ انسانی کی رفتار ہی پہنچ سکتی ہے۔

فی الواقع خدا کی مخلوق میں فکرِ انسانی سے زیادہ کوئی چیز تیز رفتار نہیں چشم زدن میں فکرِ انسانی چشمِ اُنفسُ و آفاقُ کی سیر کر لیتی ہے۔ یہی فکرِ انسانی کو سیر فی العلوم سیر فی الفنون۔ سیر فی المعانی اور سیر الی اللہ کراتی ہے۔

فکرِ انسانی اعدامِ متقابلہ کے حالات منکشف کراتی ہے اور ان کو مختلف حالتوں میں وجود بخشتی ہے دنیا میں صنعتِ انسانی جس قدر بھی واقع ہوئی ہے وہ سب کی فکرِ انسانی کی مرہون ہے ہر تصور تخلیقِ فکر کا نتیجہ ہوتا ہے اور وہی تصور بعد میں انسانی صنعت میں آکر قوتِ متشکلہ اختیار کرتا ہے اس کا تصورِ اولیٰ جو فکر سے نمود پاتا ہے وہ تصورِ اصطلاحِ علمیہ میں علتِ غائی کہلاتا ہے جو غیر مرئی ہوتا ہے انسانی دسترد میں آنے کے بعد وہی تصور خارج میں آکر علتِ صُوری اختیار کر لیتا ہے یہ جتنی مشینیں آج ارض و سما میں تہلکہ بپا کئے ہوئے ہیں یہ سب پہلے فکرِ انسانی میں تصور کی صُورت سے نمود پانے والی ہیں بعد میں عقلِ انسانی نے عالم خارج سے حسبِ دانش ان کو مہیا کیا اور مشین کی صورت میں انسانی نظروں کے سامنے ان کو چلا کر فکر کی ہیبت انگیز کرشمہ سازی کا مظاہرہ کیا فکرِ انسانی کے عملی گوشۂ فکر پر مرتب ہو کر آبادیوں کی صورت۔ باغ و بستان کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔

عمل پیرا اور تصانیف کی صنعت و حرفت کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے قرآنِ مجید نے اسی فکرِ انسانیہ کو دعوتِ عمل دی تاکہ یہ روحانی اور مادّی کائنات میں حیرت انگیز اعمال سے انسانی عقول کو ورطۂ حیرت میں ڈال کر خدا کی صحیح کارسازی کی

طرف انسانی طبائع کو مبذول کر سکے۔

قرآن مجید فکرِ انسانیہ کو صحیح راستوں پر چلانے کا مدعی ہے اور فکرِ انسانیہ اسی وقت صحیح راستوں پر چلتی ہے جب نفس کے غلیظ ہنگاموں سے اسے فطرت کی کرشمہ سازیوں کی طرف مائل کر کے بچایا جائے پروردگارِ عالم نے اپنے کلامِ پاک کے ذریعے سے فکرِ انسانیہ کے ایسے اصول مرتّب کر دیئے جن کی موجودگی میں وہ نفس کی مذموم عادات اور اس کے لاابالی خیالات سے بچنے ہی میں اپنی نجات پاتا ہے اور وہ مجوزہ اصول انجام کار فلاح و نجات کا ذریعہ بنتے ہیں۔

قرآنِ مجید کی نظر میں وہ فکر جو آگے بڑھ کر معلومات فراہم کرنے میں کوتاہی کرے وہ فکرِ نادان ہے اور اندھا پن ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ

"در حقیقت ان کی آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں۔ بلکہ ان کے سینوں میں ان کے دل اندھے ہو جاتے ہیں"۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ فکرِ دل کا اندھا ہونا ہی راہِ حق میں گمراہ ہونے کا سبب بنتا ہے ظاہری آنکھیں تو جملہ وحوش و طیور کے پاس موجود ہیں مگر عقل و فکر و دانش سے محروم ہونے کی بنا پر وہ حیوانِ مطلق کہلاتے ہیں اور انسان حیوانِ ناطق صرف اپنے شعورِ باطن کی بناء پر ہے۔

لہٰذا علیٰ وجہ بصیرت۔ اللہ تعالےٰ نے انسان کو علوم و فنون سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دی تاکہ وہ اپنے علوم و فنونِ انسانیہ کو مزید معلومات کے ساتھ اضافہ دے سکے اور انسانیت کے لئے معلومات کا دروازہ عام کر دے۔

نتیجتہً کلامِ الٰہی کی دعوتِ فکر و عمل کرامتِ انسانیہ کا اظہار چاہتی ہے اگر عالمِ اسباب میں انسان اپنی تحقیق سے ہیبت انگیز کارناموں کا اظہار کر سکتا ہے

تو یقیناً صورتِ روحانیہ میں متقیانہ تقویٰ کے ساتھ وہ حیران کن کرامات کا مالک بھی بن سکتا ہے۔

دنیا میں انسانی کرامات دو ہی صورتوں میں رونما ہوتی رہیں جنہوں نے عقول کو حیران کیا ایک معجزاتِ انبیاءؑ اللہ اور کراماتِ اولیاءؒ اللہ۔ دوسرے صنعتِ انسانیہ صرف یکطرفہ کرامت انسانیت کو مطمئن نہیں کر سکتی۔

لہذا قرآنِ مجید اپنی اسلامی تعلیمات کے ساتھ اپنے پیروکاروں کو روحانی اور مادّی کرامات کے ساتھ آراستہ و پیراستہ دیکھنا چاہتا ہے انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسّلام کی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے عالمِ اسباب میں روحانی اور مادّی وسائل سے حکمِ الٰہی کے مطابق فائدہ حاصل کرنا اسلامی تعلیمات میں ہمیشہ کیلئے داخل و شامل فرما دیا اور آخری نبی پاکؐ کی تعلیمات نے روحانی اور مادّی عوامل کو ایک دوسرے میں آخری طور پر ضم کر دیا۔

قرآن مجید

اور

مقام تفسیر

دورِ جدید کے بعض مدعیانِ تفسیر قرآن نے اجتہاد حکیمانہ سے لاپرواہی برتتے ہوئے اپنی تفاسیر کو حکمت سائنس سے بے گانہ رکھا۔ جس علم کے بل بوتے پر بعض قوموں نے تسخیر کائنات میں پیش قدمی کی اور سُپر پاور ہونے کا مقام حاصل کر لیا۔ یہ حکمت سائنس موجودہ زمانے میں اس مقام پر فائز المرام ہو چکی ہے جس پر پوری انسانیت پیکر خوف و خشیت بنی ہوئی ہے۔ قرآن مجید روحانی معراج کے ساتھ ساتھ اپنے پیروکاروں کو مادی معراج کمال حاصل کرنے کی بھی تعلیم دیتا ہے۔ وہ سب سے پہلے مبدأ ________ یعنی مادی دنیا کی تعریف نظام ربوبیت کے ساتھ کرتا ہے۔ پھر معاد یعنی آخرت کی بات کرتا ہے۔

قرآن مجید کی جامعیت مستجمع العلوم مستجمع المعانی و مستجمع الحقائق ہے۔ اس کی معنی خیز وسعتوں کو وہی علیم و خبیر جانتا ہے جس کا یہ علم و کلام ہے۔ یا وہی ہستی اس کے نزولی مقاصد اور اس کے صحیح مقام اور صحیح ماخذ اور صحیح مقصود نظر اور وسعت لامتناہی سے باخبر ہونے کی ازلی اور ابدی صلاحیت رکھتی ہے جس پر یہ قرآن مجید نازل ہوا۔ نزول قرآن کے الہیاتی الہامات وحی خفی اور وحی جلی کی صورت میں اُس مخاطب اوّل و آخر ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم پر نمودار ہوتے رہے ہیں۔ لہٰذا اس کے شانِ نزول کی جملہ کیفیات کا مہبط اوّل بھی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے۔ قرآن مجید کے جملہ اجمالی و تفصیلی استفسار کی ذمہ داری بھی رسول کریمؐ کے ذمہ ہے۔ ترتیب نزول کے اعتبار سے اللہ تعالےٰ تفسیر کے لئے اپنے رسول کا ہی انتخاب کرتا ہے کہ وہ لسانِ قرآن کا ترجمہ لسانِ قرآن کے ساتھ ہی کریں۔ قرآن لسانِ عرب کے ساتھ نازل ہوا اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم بھی عربی ہونے کی حیثیت میں لسانِ عرب کے حامل تھے۔ اللہ تعالےٰ کے حکم سے آپؐ نے سب سے پہلے قرآن مجید کا ترجمہ فرمایا اور لسانِ نبوت کے ساتھ احکامات کا ترجمہ فرما کر اعمال قرآنیہ کی تفسیر فرمائی۔

تفسیر قرآن میں افراط و تفریط دونوں سخت ناجائز ہیں لہٰذا مفسّر قرآن کے لئے اپنے گوشۂ عقل و خرد کو خوف و رجا سے معمور رکھنا چاہیئے تاکہ وہ اپنی طرف سے کسی قسم کی کمی بیشی کی جسارت نہ کر سکے۔ اسی احتیاطی صفائی عقل کے ساتھ وہ صحیح معنوں میں خدائی صداقتوں کا ترجمہ کرنے کے لئے آمادہ کار ہو سکتا ہے۔ ورنہ اپنی بے جا

تفسیر کرنے کے بعد اسے خفت و ندامت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کسی چیز کی حیثیات ذاتی کا عام طور پر بھی جائزہ لیا جا سکتا ہے مگر وہ جائزہ عام ہوتا ہے اور جائزہ علمی اور عقلی طور پر بھی کیا جا سکتا ہے مگر اس میں کبھی ذاتی رائے کے دخل انداز ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ پس کتاب اللہ کا ترجمہ و تفسیر کتاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی ممکن و معتبر ہو سکتا ہے۔

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث قرآن مجید کے تراجم اور تفاسیر کے لئے آخری معیار ہیں۔ حدیث شریف کے معیار پر جو ترجمہ صحیح اتر سکے گا وہی حقیقی ترجمہ ہوگا اور وہی حقیقی تفسیر ہوگی پھر اس کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی روایات کے معیار پر ترجمہ و تفسیر کو پرکھا جائے گا پھر اس کے بعد تابعین کے تراجم و تفاسیر کو معیار بنایا جائے گا۔ پھر تبع تابعین کے تراجم اور تفاسیر کی آئینہ داری میں ترجمہ و تفسیر پر اعتبار کیا جائے گا۔ پھر امت کے معروف ترین مفسرین کے اعتبار پر ترجمہ و تفسیر کی جائے گی۔ اسلاف میں جو مفسرین اجماع امت میں مقبول و معتبر تھے ان کے حوالہ جات کی روشنی میں جو تفاسیر لکھی گئی ہیں ان کی روشنی میں جو ترجمہ و تفسیر کی جائے گی وہ یقیناً قابل اعتبار ہوگی۔ اس سے ہٹ کر تفسیر بالرائے کرنے پر سخت وعید آئی ہے۔ خدا ایسی جسارت سے محفوظ رکھے۔ امین، ثم امین۔

خداوند ذوالجلال اور اس کے کلام کا احاطہ کرنا عقل انسانی سے بالاتر ہے اس فیصلہ کے بعد تفسیر قرآن مجید کے بارے میں اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید کے بحر بیکراں میں ہر فاضل ہر عاقل ہر عالم ہر مفکر محقق ہر دانشور حسب استطاعت علمیہ غواصی کر سکتا ہے اور حسب قسمت لُؤْلُؤٌ مَّكْنُونٌ سے اپنے دامن کو بھر سکتا ہے۔ مگر آئندہ آنے والے نقادِ معانی ان تفاسیر پر تنقید کر سکتے ہیں۔ قرآن مجید بذاتہٖ اور اس کے نصوصِ ذاتی غیر مبدل ہیں۔ مگر اس کے تراجم یا تفاسیر پر تنقید ہو سکتی

ہے۔ اوران میں مفسرین اپنے فہم کے مطابق تبدل و تغیر کر سکتے ہیں۔ سوائے ان جمہور مفسرین کے جن پر علماءِ امت نے بکثرت اتفاق کیا ہو۔ قرآن مجید کی اپنی کی ہوئی تفسیر کو معلوم کرنا مفسر کی ذمہ داری میں داخل ہے۔ اوّل وہ قرآن مجید کی تفسیر قرآن کی تفسیر کے ساتھ ہی کرے اور احادیث شریفہ کی تائید کے ساتھ بلیغ غور و فکر کی معیت میں تفسیر کرنے پر توجہ مبذول کرے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر جس کی روشنی میں خیر القرون کے شیوخ القرآن نے تفسیر فرمائی پھر ان کی تقلید میں مابعد کے مجتہدین نے اس پر عمل فرمایا اور اُن کے نقش قدم پر جمہور مفسرین نے بعد میں حالات کی نئی نئی شکلوں میں مزید تفسیر کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا۔ اس مزید احساس تفسیر نے خیر القرون کے آئمۃ المفسرین کے استدلال کو ممد و معاون بنایا۔ یہی تعاون بالتفسیر مابعد کے مفسرین کے کام آتا رہا۔ تفاسیر کا تسلسل محققین کے ساتھ ساتھ جاری و ساری رہتا ہے۔ اور نئے دور کے تقاضوں کے مطابق حالات و واقعات کا جائزہ لینے کے بعد نئے نئے معلومات کا جواز ملتا ہے۔ آنے والی نسل انسانیہ کو میدان تفسیر میں آگے بڑھنے کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ اس قسم کے تاثراتِ مفسرانہ تمام تر اللہ تعالےٰ کے پاس پہنچ جاتے ہیں اور بارگاہ اقدس ان تفاسیر کو اپنے دامن رحمت میں سمیٹ لیتی ہے۔ پھر وہی رحمت مفکرین نسلِ انسانیہ کے اذہان و قلوب پر ہمیشہ برستی رہتی ہے اور ان کی مفسرانہ روئیدگیوں کو نمو دیتی رہتی ہے جس سے آن پر تفسیر کی مزید راہیں کھل جاتی ہیں۔

رحمت خداوندی کے ہبوط و صعود کا یہ سلسلہ نسل انسانیہ کے ساتھ ساتھ بعینہٖ اس طرح وابستہ رہتا ہے جس طرح سمندر کا پانی مختلف انداز کے ساتھ چہار دانگ عالم کی زمینوں پر تقسیم ہوتا ہے۔ یعنی کہیں بخارات بن کر فضاؤں میں بلند ہو کر زمین پر برستا ہے، کہیں زمین کے اندرونی حصوں کو متاثر کرتا ہوا

زمین کے رگ و ریشہ سے گزرتا ہوا اور متاثر کرتا ہوا سطح زمین پر نمودار ہوتا ہے اور کائنات کے دشت و جبل سے چشموں کی صورت میں اُبلتا ہوا دریاؤں کی صورت میں بہتا ہوا صفحۂ ہستی کی چھپی ہوئی روئیدگیوں کو سبزہ زاروں میں بدلتا ہوا پھر واپس سمندروں میں چلا جاتا ہے۔

بالکل اسی طرح کلام الٰہی کے جملہ تراجم اور تفاسیر اور تشریحات اور توضیحات اور تعریفات انسانیت کی عقل و خرد کی چھپی ہوئی روئیدگیوں کو بالیدگیوں میں تبدیل کرنے کے بعد انسانی دسترخوان پر معلومات کا اضافہ در اضافہ کرنے کے بعد پھر اپنے معلم حقیقی کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِلَيۡهِ يَصۡعَدُ الۡكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالۡعَمَلُ الصَّالِحُ يَرۡفَعُهٗ

یعنی تمام نیک باتیں اور نیک اعمال اللہ تعالےٰ کی طرف لوٹ جاتے ہیں یا اللہ تعالےٰ کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔

اس آیت شریفہ میں کلمہ طیّب سے مراد وہ محتاط اور اعلےٰ کلام ہے جس کو ہر قسم کے اختراعاتِ نفسانی اور اختراعاتِ عقلی سے مکمل طور پر بچا کر لوجہ اللہ ادا کیا جائے۔ وہ ایسا کلام ہو جو عالمین پر احاطہ کرے۔ مخترعات کا دامن اتنا زیادہ تنگ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذاتی ظرف سے بھی بے گانہ ہوتے ہیں۔ اختراعات کرنے والوں کا کلام تو اپنے آپ کو بھی نہیں سمجھ سکتا۔ چہ جائیکہ وہ کلام الٰہی کے مفسّر ہونے کا دعویٰ کر سکیں

آئمہ تفسیر نے خوف الٰہی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بصیرت متقیانہ کے ساتھ ترتیب کے فطری قرینوں کے ساتھ ماضی کی جید اور مستند اور معتبر تفاسیر کی روشنی میں اور تقلید میں اپنی تفاسیر کی بناؤں کو استوار کیا۔ ایک طرف ان کی تفاسیر نے اپنے اسلاف کی سندات پیش کیں اور ان کے علوم کی بھی حفاظت کے فرائض انجام

دیئے۔ اور دوسری طرف ان اسناد کی روشنی میں حالات حاضرہ کی بھی صحیح ترجمانی فرمائی جس سے تفسیر قرآن کے مزید گوشے وضاحت کے ساتھ سامنے آئے۔ یہ وہ اصول تفسیر ہے جس کو قرآن مجید کی تفسیر کے مطابق کہا جاسکتا ہے اور یہی وہ اصول ہے جس کے ساتھ قرآن مجید کے لفظی تراجم تفسیری حیثیت تشریحی نوعیت تفصیلی مقام اور توضیحی بلاغت سب کا اعتبار شامل تراجم ہو جاتا ہے۔ نیز جس کے ساتھ سچائیوں کا ترجمہ ہو کر انسانی قلوب و عقول کو اطمینان بخشتا ہے۔ کسی گوشۂ علم کے نامکمل رہ جانے سے قدرتی طور پر گوشۂ عمل نامکمل ہو جاتا ہے۔ نصوص قرآن مجید خود اپنی کامل تفسیر کے ساتھ اعمال صالحہ کی تفاصیل پر بات کرتے ہیں تاکہ انسانی طبائع تعارف اعمال میں غلطی سے بچتی ہوئی اصول قرآن کے مطابق عمل صالح کو جاری رکھ سکیں۔

اس اعتبار و لحاظ تفسیر کے ساتھ علم و حکمت اور عرفان تینوں کی مسلسل ضرورت در پیش آجاتی ہے تاکہ علم تفسیر مزید فضیلتیں حاصل کر سکے۔ انسان کا ذاتی علم مجوزہ علوم کے بغیر جن کو علم العلوم کہا جاتا ہے۔ بہت محدود اور بہت مختصر ہے جن کو صرف قوت لایموت حاصل کرنے کا ذریعہ کہا جاسکتا ہے۔ ایسا علم، علم ناقص ہے۔ جس سے آگے نکل کر صفات انسانیہ حاصل کرنے کے لئے علم العلوم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس علم کا حصول علم تفسیر اور علم اشیاء کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جس طرح نباتات کو نشو و نما کے لئے حرارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ علم العلوم کے ساتھ حکمت العلوم کا ہونا علم کی ارتقائی حیثیت ہے۔ جس علم کے ساتھ انسان حکمتوں کو اخذ کرتا ہوا اشیاء کی تشریحات کا باب کھولتا ہے اس علم سے علوم کو اتنی تقویت مل جاتی ہے کہ وہ منزل تحقیق و تشریح میں محققین کے لئے چراغ راہ بن جاتے ہیں۔ حکمت العلوم کے ساتھ عرفان العلوم کا ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ چراغ کی روشنی میں کسی چیز کو دیکھ کر اس کی صورت کا صحیح تعارف حاصل کیا جاتا ہے۔

بغیر تعارف اشیاء کے مزید تشریحات حاصل کرنے کی تحریص نہیں مل سکتی۔ لہذا تشریحات کے لئے مزید ترغیب اور تحریص حاصل کرنے کے لئے عرفان العلوم کا حاصل کرنا اشد ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ سب علوم اپنے اپنے مقام پر ایک دوسرے کے محتاج کر دیئے گئے ہیں علم العلوم حکمت العلوم کا اور حکمت العلوم عرفان العلوم کا اور عرفان العلوم علوم الحکمت کا اور علوم الحکمت کو حکمت الحکمت کا حکمت الحکمت کو عرفان الحکمت اور عرفان الحکمت علوم العرفان کا اور علوم العرفان کو حکمت العرفان کا اور عرفان الحکمت کو عرفان العرفان کا محتاج کر دیا گیا ہے۔ عرفان الحکمت اولیاء اللہ کا آخری علم ہے جس میں تکوینی کونی ومکانی سارے علوم آجاتے ہیں اور یہاں سے صریح طور اور اعلانیہ مشاہدات کا دور دورہ شروع ہو جاتا ہے جو اشتیاہ قلب ونظر کی انتہائی منزل ہے۔ اس مقام پر پہنچے ہوئے علماء کے بارے میں ارشاد ہے۔

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓءُ ط

یعنی صرف اللہ تعالےٰ کے اہل علم بندے ہی اس سے ڈرنے والے ہیں یعنی کامل خوف کو علماء حق کے ذاتی علوم پر منحصر کر دیا گیا ہے۔ اور یہ بیان کئے گئے جملہ علوم کو اکٹھا کیا جائے تو کامل نصاب تعلیم بنتا ہے۔ پی ایچ ڈی کی صحیح ڈگری اس نصاب کی فراغت کے بعد ہی مل سکتی ہے۔ اس کالج کے اکثر معلمین کتاب ناطق کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس سے کم درجے کے علماء کتاب صامت کے علماء ہیں صامت کتابیں خود نہیں بولتیں تو یہ علماء بول کر طلباء کو سمجھاتے ہیں مگر کتاب ناطق سے مراد وہ لوگ ہیں جو خدائی پیغامات اپنی مبارک زبانوں سے پڑھ کر سناتے ہیں۔ یہ انبیاء و مرسلین کی جماعت ہے جن کو اللہ تعالیٰ اپنی جناب سے علم و عمل دے کر بھیجتے ہیں۔ اسی واسطے ان کے اقوال و افعال انسانیت کے لئے نمونہ ہوتے ہیں۔ آخری کتاب ناطق کا درجہ سرکار ابد قرار ختمی مرتبت نبیٔ اکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ

وسلم کو عطا فرمایا گیا۔ اور ان کے آخری ناطق ہونے کی تصدیق خود پروردگار عالم نے ان مبارک الفاظ کے ساتھ فرمائی۔

مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خواہش نفسانی کے تابع مطلقاً بولتے ہی نہیں۔ وہ وہی کچھ بولتے ہیں جو اللہ تعالےٰ کی ذات بولتی ہے۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود۔ ❊ گرچہ از حلقوم عبداللہ بود۔

چونکہ اس کتاب ناطق کا انحصار صرف اور صرف قول خداوند ذوالجلال پر ہے، نہ کہ کسی خارجی کتاب و گفتار پر۔ اس کے بعد آپ کے خلفاء کا مقام ہے۔ چونکہ انہوں نے جو جو دروس حاصل کئے وہ سب کے سب کتاب ناطق کی زبان پاک سے بنفس نفیس سن کر حاصل کئے تھے اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ ط

یعنی اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجئے کہ میں اور میرے صحابہ تم سب لوگوں کو اللہ کی طرف علی وجہ بصیرت دعوت دیتے ہیں۔

ان مذکورہ علوم میں سے کسی ایک علم کی کمی واقع ہو جائے تو تفسیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ ایسی تفسیر کے ناقص رہ جانے کا غالب امکان ہو جاتا ہے۔ تکمیل تفسیر کیلئے ضروری ہے کہ مفسرین ان مذکورہ علوم کو حاصل کریں۔ بغیر ان علوم کے کسی شے کی حقیقت تک پہنچنا دشوار تر مرحلہ ہے۔ ان علوم کی روشنی میں کسی شے کے صفاتی مرحلے طے کئے جا سکتے ہیں اور اس کی حقیقت تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے اگر حقیقت شے میسر نہ آسکے تو تفسیر تشنۂ تکمیل رہ جاتی ہے۔ دنیا کی کسی شے کی ترجمانی مذکورہ علوم کے بغیر نہیں ہو سکتی تو پھر قرآن مجید کی تفسیر کا ان علوم کے بغیر دعوےٰ کرنا ایک نارسا جسارت کے سوا کچھ نہیں۔ قرآن مجید اپنی ذاتی تفسیر کے ساتھ اولاد آدم کی تفسیر وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ کے ساتھ کرتا

ہوا اُسے جملہ خلائق پر برتری دیتا ہوا اُسے تشرّف و تکرّم کا تاج پہناتا ہے۔ کیونکہ وہ صاحبِ عقل و دانش اور صاحبِ دید و شنید ہے اور محسوسات کا ادراک کرنے کی اس میں کامل صلاحیّت موجود ہے۔ کائنات کے جملہ محسوسات کو اور محسوسات کی مرئی اور غیر مرئی تاثیرات کو اس کے سامنے تمثال بنا دیا گیا ہے تاکہ وہ اُن کو مسخر کر سکے۔ پھر قرآن مجید اس عالم مثال کی انسان کے سامنے اس طرح آئینہ داری کرتا ہے جس طرح سورج گوشۂ عالم کو روشن و تابناک کر دیتا ہے۔ آنکھوں کی آئینہ داری مرہونِ ضیاءِ آفتاب ہوتی ہے جب تک گوشۂ عالم پر روشنی عارض نہ ہو، آنکھ آئینہ داری نہیں کر سکتی اور مطالعۂ کائنات یا مطالعۂ اشیاءِ عالم بغیر روشن آفتاب محال ہو جاتے۔

قرآن مجید اور اس کی تفسیر کا منشا گوشۂ عالم کی ظاہری اور باطنی صورتوں پر روشنی ڈال کر بصیرت انسانیہ کی آئینہ داری ہے۔ لہٰذا قرآن مجید کو صرف اللہ تعالیٰ کے مفاہیم تک محدود رکھا اور انفس و آفاق کا ادراک نہ کرنا حصول نعمت سے فکر انسانی کو روک دینے کے مترادف ہے۔ چونکہ قرآن مجید ایک کامل و مکمل نصاب تعلیم ہے۔ نصاب تعلیم کی فراغت حاصل کرنے کے لئے طالب علم کو کالج کی حدود میں مقید کر دینا اور نصاب تک محدود کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ طالب علم کے حصول علم کا مطلب کالج کے لئے تھا نہ کہ لوگوں کے لئے تھا حالانکہ تعلیم کے حاصل کرنے کا مدعا یہی ہوتا ہے کہ فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ کالج سے باہر آئے اور جس شعبۂ زندگی کے لئے اس نے علم حاصل کیا ہے اس شعبۂ زندگی کو اپنے حاصل شدہ علم سے بہرہ ور کرے اور دارالعلوم کی دیواروں سے نکل کر علم کی روشنی پھیلائے اور مزید معلومات حاصل کرے۔ اگر علم معلومات کے لئے نہ بڑھا جائے تو ایسا علم برائے علم کے سوا کچھ نہیں، قرآن مجید صرف نصاب تعلیم میں

محدود و مقید ہونے کی قطعاً تعلیم نہیں دیتا بلکہ وہ اپنے علوم ابدی و سرمدی کے ساتھ صحیفہ کائنات کے مزید در مزید معلومات حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہے بلکہ وہ اپنے طالب علم کو عالم روزگار کے میدان تحقیق میں اتنا ارفع و اعلےٰ دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ کوئی امکانی و زمانی حالات کا صحیح جائزہ لے کر ان کو مسخر کرتا ہوا اور ان کو متاع زندگی بناتا ہوا اپنی انسانی تفوق اور برتری کا اظہار کر سکے۔ پس ہر مفسر قرآن پر یہ لازم عائد ہوتا ہے کہ وہ علم و حکمت اور عرفان کے ساتھ ساتھ پوری انسانیت کے سامنے ایک مایۂ ناز محقق ہونے کا ثبوت دے سکے۔ ورنہ نہ تو وہ حسین العلم ہونے کا مقام پا سکے گا اور نہ ہی حسین العمل بن سکے گا۔ ایسی فقدانیت فکری صلاحیتوں کو زوال پذیر کر دیتی ہے اور یہ محرومی احتیاج کی صورت میں نمودار ہو کر جاکر غیر بنا دیتی ہے اور کوئی جاکر کبھی بھی آزادی رائے حاصل نہیں کر سکتا۔ قرآن مجید اپنے پیروکاروں کو اپنی ذاتی صلاحیتوں سے کماحقہٗ بہرہ ور دیکھنا چاہتا ہے۔ قرآن مجید اپنے اطاعت شعاروں کو پابند آئین ہو کر میدان کارزار میں مسلسل فتوحات حاصل کرنے کا سبق دیتا ہے قرآن مجید کا سب سے عظیم ترین پہلو اس کا طرز تعلیم ہے جو اجزائے روح اور اجزائے کائنات دونوں کا بیک وقت ترجمہ کرتا ہے ہر زمانے کے مطابق اپنے ماننے والوں کو علوم و فنون تکوینیہ کے ساتھ مطالعہ کائنات کی ترغیب دیتا ہے۔

دنیا والوں نے آفرینش آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک جن جن چیزوں کو معلوم کیا اور جن مزید معلومات کے لئے آگے بڑھنا چاہتے ہیں، ان سب کا ذکر اس انداز کے ساتھ کر دیا جس پر غور کرنے سے ان معلومات کو حاصل کرنے کی مزید تحریص پیدا ہو اور ان کو حاصل کرنے میں آسانی ہو۔ اگرچہ بعض بیدار قومیں تفسیر اشیاء تعلیمات ربّانی سے ہٹ کر کر رہی ہیں تاہم وہ ضابطہ قرآن کی تعلیمات

سے الگ نہیں ہو سکتیں ۔ چونکہ انسانیت جو معلومات حاصل کرتی ہے وہ خداداد عقل و دانش کی بنا پر یا خداداد صلاحیتوں پر حاصل کرتی ہے ۔ انسانیت سے حاصل کردہ معلومات کی قرآن مجید نے نشان دہی کر دی ہے ۔ قرآن مجید کی طرز تبلیغ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیروکاروں پر جہاں ارکان عبادات کے حقوق کی نگہداشت کی ذمہ داری عائد کرتا ہے وہاں تشریح کائنات کے حقوق کی رعایت پر بھی تبصرہ کرتا ہے ۔ دور حاضرہ کی فلک گیر حکمت یعنی سائنس بھی ۔ اگر غور اور انصاف سے دیکھا جائے تو صاف طور پر معلوم ہو جائے گا کہ دور حاضرہ کی فلک گیر حکمت یعنی سائنس کی تعمیر بھی علوم ماضیہ کی بنیادی حکمت پر رکھی گئی ۔ قرآن مجید نے لَا اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْبَرُ فرما کر ایک ذرے اور منیفے سے لے کر ساری کائنات کو اپنے مضمون میں سمیٹ لیا تاکہ اس کا طالب علم میدان تحقیق میں دوسرے اہل تحقیق کے سامنے کہیں مایوس ہو کر اپنی تحقیقات کے ہتھیار نہ ڈال دے ۔ درحقیقت تفسیر قرآن مجید کا ماحصل روحانی اور مادی کائنات کی اور اجزائے کائنات کی تفسیر ہے ۔

عقل انسانی اپنی عظمت عقلیہ انسانیہ کے ساتھ اجزائے عالم کا بہت سارا تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ بہت سی نامعلوم چیزوں کو معلوم کر کے اپنے دسترخوان معلومات پر سجا چکا ہے اور معلومات کے انبار پر انبار لگا رہا ہے اور کئی چیزوں کے وجود تبدیل کرنے کے بعد ان کو دوسرے قسم کے وجود دے چکا ہے ۔ اور ان مشہودہ معلومات کو جامۂ تکمیل پہنا کر انسانیت کی شہادت حاصل کر چکا ہے اور شہادت علمی شہادت فنی حاصل کرنے کا لوہا منوا چکا ہے جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ ایسی شہادت کا انکار صداقت مشہود کا انکار ہے ، ذرۂ بے مایہ کو سب انسان ذرۂ بے مقدار کہتے رہے ہیں ۔ اور یہ کہتے رہے ہیں کہ یہ ذرۂ

یعنی ذرّہ ایسی جُز ہے جس کا تجزیہ نہیں ہو سکتا۔ یعنی اس کے ٹکڑے نہیں ہو سکتے مگر تحقیق انسانی نے ذرّے کے دو ٹکڑے کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ذرے کے دو ٹکڑے ہو سکتے ہیں اور یہ کہ اس کو توڑا جا سکتا ہے۔ ذرے کی اس تحقیق نے آفتاب عالم تاب کی قدیمی ذرّہ نوازی کے وہ تاثیرات طشت از بام کر دیئے جو ذرّے کے ساتھ ہمیشہ سے متعلق رہ کر بھی نگاہ انسانیت سے مستور و محجوب رہے آج کی حکمت سائنسیہ نے یہ ثابت کر دیا کہ ہر ایک ذرّۂ آفتاب و مہتاب اور جملہ سیاروں کی شعاعوں کو ہزارہا برس اپنے سینہ میں جذب کرتا رہتا ہے اور سورج کی حرارت کا ذخیرہ کرتا رہتا ہے۔ ذرّے کی اس قوت جاذبہ نے عقل و دل و نگاہ کو اس طرف متوجہ کر دیا ہے کہ وہ اس کو اپنے متاع زندگی میں اولیت دے سکے اس قوت مسخرہ کا نتیجہ ایٹم بم کی صورت میں نمودار ہوا اور انسانیت کو اپنی ہیبت انگیز قوت و طاقت سے لرزہ بر اندام کر دیا۔ یہ کرشمہ سازیاں حکمت العلوم کا ایک حصّہ ہیں جن کو حاصل کرنا قرآن مجید کی تعلیمات نے لازم قرار دے دیا۔ اور اپنے طالبعلموں کو اس نے یہ حق بھی تفویض کر دیا تھا کہ وہ حکمت العلوم کے ساتھ حکمت الحکمت کا سراغ لگائیں اور یہ کہ علوم حکمت کو چراغ راہ بناتے ہوئے عرفانِ اشیاء کا مقام حاصل کریں۔ مگر بدقسمتی سے دورِ جدید کے بعض مدعیانِ تفسیر قرآن اجتہاد حکیمانہ سے لاپرواہی برتتے ہوئے حکمت سائنس سے بے گانہ ہو گئے جس کو دنیا کے اہل علم و دانش نے اکتساباً حاصل کر لیا۔ یہ حکمت سائنس عملاً اس مقام اعلےٰ پر فائز ہو چکی ہے کہ انسان خود اس دانش برہانی سے پیکر خشیّت بن چکا ہے۔ سائنس اپنی اس ہیئت مشہودہ کے ساتھ گویا قیامت کی ترجمان ہو چکی ہے۔

یہ ترجمانی علمِ سائنس کی بنا پر ہوئی۔ قرآن مجید حکمت العلوم کا داعیٔ آخر ہے علم حکمت سے ہی تشریحات کا باب کھلتا ہے اور کامل تشریحات کے ساتھ

ہی انتباہِ قلب میسر آتا ہے۔ دانش نورانی علوم ظاہری کے ساتھ تصوراتِ اشیاء پیدا کرتی ہے اور یہ تصورات تخلیقات کے لئے ذہن انسانی میں پیدا ہوتے ہیں جب تک یہ متصور رہتے ہیں اُس وقت تک علتِ صوری کی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں جس تخلیق کے لئے یہ متصور ہوتے ہیں جب وہ بن کر تیار ہوجاتی ہیں، یعنی وہ تصوّر متشکل ہو جاتا ہے اس وقت یہ دانش نورانی دانش برھانی میں تبدیل ہو جاتی ہے یہ عقل انسانی سے جب یہ عظیم برہانی کرشمہ بن کر سامنے آجاتی ہے تو انسان جس سے یہ برہان صادر ہوا وہ خود بخود ورطۂ حیرت میں گم ہو جاتا ہے اگر یہ متشکل صورت برہانی کوئی خوفناک یا خطرناک چیز ہوتی تو انسان پر اس کی ہیبت طاری ہو جاتی ہے جیسے ایٹم بم کہ یہ پہلے انسان کا تصوّر نورانی تھا جب وہ بن کر سامنے آگیا تو یہ اس کی برہانی تشکل ہوگئی۔ یہ چیز لامحالہ بنانے والے کیلئے بھی خوف و خشیت ہوگی جیسا کہ آج کل سائنس دان ایٹم بم بنانے کے بعد پیکرِ خشیّت بنے ہوئے ہیں اور اقوام ایک دوسرے کی ایٹمی قوت سے لرزاں و ترساں ہیں اور خوف کی وجہ سے ایک دوسرے پر مسابقت حاصل کرنے کی فکر میں مبتلا ہیں کبھی ایٹمی قوت کو تباہ کرنے کے لئے باہمی مشورے کرتی ہیں اور ذہنی کشمکش میں ہچکولے کھا رہی ہیں۔ اگر اقوام ایٹمی طاقتوں کو تباہ کرنے میں ناکام ہوگئیں تو ایک دن ایسا آئے گا کہ وہ خود تباہ و برباد ہو کر صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گی۔

بہرکیف علم حکمت تشریحات کے ابواب کھولتا ہے اور مادہ پرست لوگوں کا علم و حکمت انہیں نفسانی خشیت دیتا ہے مگر خدا پرست لوگوں کو وہ خشیت اللہ دیتا ہے جیسا کہ قرآن مجید برہان رشید اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا فرما کر خشیت اللہ کو علماء حق کے ساتھ متعلق کر دیتا ہے یعنی وہ علماء جو علم و حکمت سے بہرہ ور ہو کر کائنات اور اشیاء کائنات کی تشریح

کرتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ خشیت بغیر ہیبت کے واقع نہیں ہو سکتی۔ خدائے لم یزل کی ہیبت اس کی حیرت انگیز تخلیقات کے ساتھ وابستہ ہے نظام تخلیق اور اس کی تاثیرات ہی عقل انسانی کو حیرت میں ڈالنے والا خدائی کارنامہ ہیں۔۔ وہ ذاتی طور پر بھی جلالت والی اور ہیبت والی ذات ہے۔

مگر وہ ایسی ذات ہے جو خود سامنے نہیں آتی اس ذات کو سوائے نبی آخر الزمان حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی نے نہیں دیکھا۔ اگر انبیاء و مرسلین میں سے کسی نے دیکھا تو اس ذات خداوندی کو نہیں دیکھا بلکہ ذات کی تجلیات کو دیکھا جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے کہ جب جبل طور پر خدا کی تجلی کو دیکھا تو وہ مدہوش ہو کر زمین پر گر پڑے اس کے علاوہ کسی نبی یا رسول نے ذات پاک کو دیکھنے کا دعویٰ نہیں کیا، سوائے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے آپ نے معراج شریف میں اپنی پیشانی کی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کی زیارت فرمائی۔ اور کسی دوسرے نے اس ذات کو نہیں دیکھا اور نہ آئندہ کوئی آنکھ دیکھ سکے گی۔ صرف علم یقین کے ساتھ ہی اس کا یقین ذات و صفات ہوتا ہے مگر برہانی طور پر نظام تخلیق کی حیرت انگیز تاثیرات کی روشنی میں اس کا سراغ ملتا ہے جس سے اہل علم و حکمت کے دل میں صحیح خشیت پیدا ہوتی ہے اور اُن کے دلوں پر اللہ تعالےٰ کی ہیبت طاری ہو جاتی ہے جب وہ الہیاتی علوم کے ساتھ اور عقل خداداد کے ساتھ اس کی بنائی ہوئی مخلوقات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہ مشاہدہ تو سرسری مطالعۂ کائنات کے ساتھ سطحی مشاہدہ ہوتا ہے۔ مگر تشریحات کائنات یا تشریحات اشیاء کائنات کے ساتھ سب سے پہلے مادّی حیثیت پیدا ہوتی ہے۔ یہی مادی حیثیت خشیت ربانی کا باعث بنتی ہے۔

جیسے ایک ذرّہ بے مقدار کی تشریح پوری انسانی دنیا کو ہیبت میں ڈال سکتی ہے تو آفاق عالم کی مزید تشریحات انسانیت کے لئے کتنی زیادہ ہیبت کا باعث بنیں گی۔ اس آیت میں صرف علماء محققین کو صاحب خشیت قرار دیا گیا ہے۔ پس قرآن مجید کی تفسیر بھی اہلِ حکمت علماء محققین کے ذمہ ہے۔ سائنسی علم کل نہیں مگر علوم کی جزو لاینفک ضرور ہے اور نصاب تعلیم سے کسی جزوی علم کو بھی جدا نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن مجید کی تقسیم علم میں سائنس کا علم ایک خاص قسم کا حصہ علم ہے یا ایک خاص الخاص باب ہے۔ جس کو اس کے طالب علموں میں ایک کورس کی صورت میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

تفسیر قرآن مجید کے لئے علوم ارضیہ علوم سماویہ، علوم ریاضی، علوم معرفت یعنی علوم روحانیہ، علوم مادیہ اور معلومات انسانیہ سب کی ضرورت در پیش آتی ہے۔ مسلمانان عالم تفسیر قرآن مجید کو عملاً اسی وقت سمجھنے کے قابل ہوں گے۔ جب وہ اس کی روشنی میں روحانی اور مادی تجزیہ کرنے میں کامیاب ہوں گے قرآن مجید میں تسخیر کائنات کا برملا ذکر آیا ہے علوم تسخیر کائنات کو کوئی بھی خارج از نصاب قرآن نہیں کہہ سکتا۔ چنانچہ قرآن مجید کے مختلف مقامات میں تسخیر کائنات پر کھلا تبصرہ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر تسخیر جبال، تسخیر فضا، تسخیر اقصائے عالم، تسخیر برو بحر، تسخیر شمس و قمر و تسخیر نباتات و جمادات بالتصریح بار بار ذکر آیا ہے اور یَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ فرما کر آنے والی جدید تخلیقی تکنیکی سواریوں کو بطور مشین ثابت کر دیا اور فرمایا۔

یَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ط

"یعنی اے جنّو اور انسانو! تم اگر گوشۂ عالم کے اور آسمانوں کے کناروں سے

آگے بڑھنا چاہو تو نہیں بڑھ سکتے مگر اللہ تعالےٰ کی تائید سے یا قوت علمیہ کی دلیل سے آگے بڑھ سکتے ہو۔

یہاں پر اس آیت میں اِلَّا بِسُلْطٰن فرما کر نفی عبور اقصائے عالم ارضی و سماوی کو مستثنٰے قرار دے کر دلیل کے ساتھ عبور اقصائے عالم کو ثابت کر دیا۔ اگر سُلطٰن کے معنی دلیل لئے جائیں تو دلیل قوۃ عملیہ ثابت ہوتی ہے اور اقصائے عالم کو عبور کرنے کے لئے جن دلائل علمیہ و عملیہ کی ضرورت ہو سکتی ہے وہ یقیناً یا تو سائنسی تیکنیکی ہوں گی یا روحانی یا معجزاتی نظام سے متعلق ہوں گی۔

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو عبور اقصائے عالم کے ساتھ آسمانوں کا معراج نصیب ہوا۔ یہ ایک معجزانہ قوت عمل تھی۔ اور فرشتوں کا اقصائے عالم کو عبور کرنا روحانی قوت کرامت ہوتی ہے۔ مگر باقی انسانوں کے لئے عبور اقصائے عالم صنعتی تکنیکی حکمت عمل سے ہی ہو سکتا ہے جس کو آج راکٹوں اور راکٹ بردار انسانوں نے اپنی قوت عقلیہ، علمیہ، انسانیہ کے ساتھ عبور کر کے ثابت کر دیا۔ صنعتِ انسانیہ کیمیائی قوتوں کے ساتھ اقصائے عالم کو عبور کر سکتی ہے۔ اس قسم کے اور بہت حوالہ جات ہیں۔ جن سے روحانی تسخیر کے بعد مادّی طاقتوں کے ساتھ بھی عبور کائنات کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے کیونکہ مادّی صنعت پر بھی انسان کا ہی تصرف رہا ہے جو آئے دن مزید معلومات کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اور ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے۔ یہ رفتار حکمت و دانش کے بل بوتا پر ثابت ہو رہی ہے کہ انسان مزید آگے بڑھے گا اور مزید حیرت انگیز حالات کا انکشاف کرنے میں کامیاب ہو گا۔ انسانی علم و دانش نے یہ بیباکانہ روش پیدا کر دی ہے کہ انسان بہت سے لاینحل مسائل حل کرتا چلا جا رہا ہے اور اس میں یہ بے باکی علم حکمت نے پیدا کی ہے

تیرا اندیشہ افلاکی نہیں ہے
تیری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری
تیری آنکھوں میں بے باکی نہیں ہے — اقبالؔ

اقبال مرحوم نے اپنے ان اشعار میں مسلمانانِ عالم کو مخاطب فرمایا ہے کہ تم صاحب معراج کی اُمت ہو اور صاحب معراج کے پیروکار ہو مگر بلندی افلاک کو عبور کرنے کی قوت سے بے خبر ہو۔

اگر سلطان کے معنی تائید خداوندی لئے جائیں تو بھی جملہ معجزات انبیاء و جملہ کرامات اولیاء اللہ اور جملہ تخلیقی کرامات انسانیہ تائید خداوندی کا ہی تو نتیجہ ہوتی ہیں اور جملہ قسم کی صنعت انسانیہ بھی تو تائید خداوندی کا ہی نتیجہ ہوتی ہیں۔ اس طرح انسانی کرامات اللہ کا ہی فضل ہوتی ہیں جو افضل کی جانب سے مفضول کو تفویض کی جاتی ہیں۔ فضل کا عروج قدرتی طور پر افضل کی جانب ہوتا ہے اور افضل کی تائید ہمیشہ فضل کی طرف ہوتی ہے۔ یہی تدبیر خداوندی مفضول میں بھی کارفرما ہے کہ ہر چیز اس کے فضل کا مظہر ہوتی ہے اور اس کی ربوبیت سے جہاں ہر چیز تدریجاً اپنے معراج کمال تک پہنچتی ہے۔ جہاں عقل انسانی بھی اپنے مبادیات سے فضل الٰہی کے ساتھ کہیں انبیاء و مرسلین کی صورت میں معجزات بن کر سامنے آتی ہے اور کہیں اولیاء اللہ کی کرامات باہرہ کی صورت میں ظہور پذیر ہوتی ہے کہیں صنعت انسانیہ کی صورت میں جلوہ گر ہو کر معراج کمال پاتی ہے یہ سب کچھ خداوند عالم کی صفتِ ربوبیّت کا تصرّف ہے کہ عقول انسانیہ مختلف حالات میں اپنا عروج پا رہی ہیں۔ اگر عقل انسانی سے یہ حیرت انگیز مشاہدات و مظاہرات نمودار نہ ہوتے تو خدا کی کائنات کا تشریحاتی ترجمہ نہ ہو سکتا۔

ابھی سلسلہ کائنات اور سلسلہ عقل و خرد جاری و ساری ہے اور انسانیت کے جدید کارنامے بھی ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ اولاد آدم مزید پھیلنے اور پھولنے کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔ اجرام فلکی کی تاثیرات زمین کے سمندروں میں مد و جزر پیدا کرتی ہیں اور رحم مادر میں بچوں کے وجود کو متاثر کرتے ہیں۔ پھل پھول تک اُن سے رنگ و ذائقہ حاصل کرتے ہیں۔ زمین پر بسنے والی زندگانیاں اُن سے حرارت و برودت حاصل کرتی ہیں۔ یہی اجرام فلکی حیات انسانیہ اور حیات حیوانیہ کا باعث ہیں۔ نظام کائنات کی نبض حیات چل رہی ہے۔ خدا کی قدرت کے تصرفات وہ آیات ہیں جو انسانی عقول کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

ابھی تک چشم فلک معراج انسانیت سے سیر نہیں ہو سکی بلکہ وہ مزید کچھ دیکھنا چاہتی ہے۔ اس مکرم ترین انسان کے آسمان بالا پر متمکن ہونے کے بعد ہی انسانیت کی چشم کمال خوش ہو گی۔ اس واسطے کہ یہی انسان متصرف کائنات ہے جس کے لئے عالمین کو بنایا گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ کا منشاء بھی اسی وقت پورا ہو گا جب اس کا مکرم انسان اس کی وحدانیّت پر ایمان لاتے ہوئے اس مفوضہ کائنات کو اپنے تصرّف میں لائے گا۔ قدرت خداوندی کا مظہر اتم انسان ہے اور انسان ہی کے کمال سے کمالات خداوندی کی حقیقی عقدہ کشائی ہو گی اور لاتعداد رازہائے خداوندی طشت ازبام ہوں گے۔

قرآن مجید
اور
فلسفۂ ریاست

وہی شخصیت ریاست میں سیادت وقیادت کی حامل ہو سکتی ہے جو ارکانِ خدمت کو جانتی ہو اور ارکان خدمت کی مکمل رعایت کرتی ہو اور اس کی منتظمانہ خدمات ریاست کے باشندوں کو خودکفیل بنانے کی ضامن ہو۔ خلیفۂ مجاز یا حاکم مجاز ہونا اسلام کی نظر میں ریاست کا کفیل ہونے کے مترادف ہے۔ اللہ اپنی تعلیمات کے ذریعے اسلامی حکومت کو منشائے فطرت کے مطابق معرض وجود میں لاتا ہے، تاکہ افرادِ سیاست ہمہ گیر تدبر کی قیادت میں ریاست کو اس قدر ترقی دیں کہ وہ اقوامِ عالم کے سامنے نمایاں ہو کر حکومت الٰہیہ کا مظہر بن سکے۔

قرآن مجید اسلامی ریاست کا تصور۔ ریاست کے باشندوں کو تسلیم ورضائے حق کے ساتھ ضابطۂ حق کا پابند بناتا ہے۔ وہ حاکمیتِ مطلق کا سزاوار اللہ تعالٰے کو قرار دے کہ حاکمِ مطلق کی حکمرانی کا غلبہ حاکمِ مجاز کے ذریعے کرانے کی پابندی عائد کرتا ہے تاکہ اللہ تعالٰے کی مخلوق ریاستِ اسلامیہ میں امن وعامہ کے ساتھ خدا کے مفوضہ منافعوں سے بے بہرہ نہ رہے۔ ریاست کی روحانی و مادّی صلاحیتوں کا منبع تعلیمات انسانیہ کو قرار دیتا ہے۔ اس کے فطری زاویۂ نگاہ میں یہ منبع انسانی تعلیمات کا مصدر نہیں ہے بلکہ خدائے برتر کی تعلیمات ہی ریاست کے علوم وفنون کا ذریعہ بنتی ہیں۔ ان تعلیمات کی سطح مرتفع عقیدہ توحید و رسالت ہے۔ یہ اتنا بلند نظریہ ہے کہ اس کی بلندیوں تک کوئی نظریہ نہیں پہنچ سکتا۔ صرف ریاست کے حاکمِ اعلےٰ کی حسن تدبیر اور مفکرّینِ ریاست کی متحدہ تدبیر ان فطری ضابطوں سے حصولِ استفادہ کی مجانہ ہے۔ اس واسطے قرآن مجید ریاست کے عوام کی تعلیم و تربیت کے لئے اُن میں سیادت حقہ کا انتخاب کرتا ہے اور سیادت کے جملہ اجزاء کو من حیث المجموع طور پر سیدّ القوم کو سونپتا ہے۔ قرآن مجید کا نظریۂ سیادت ریاست میں برائے سیادت نہیں بلکہ نظریۂ سیادت کو خدمت کی اس عظیم سطح پر معمور کرتا ہے جہاں سے وہ اپنی بصیرت حاکمانہ کے ساتھ ہر ادنیٰ و اعلیٰ کو دیکھ کر اس کے حق میں بہتر فیصلہ دے۔ اور ریاست کی دنیائے افادیّت سے ریاست کے باشندوں کو مطلع کر سکے۔ اور ان کے حصول کے لئے انہیں مختلف ساز و سامان کے ساتھ آمادۂ کار کر سکے۔ اسی لئے سیادت کے انتخاب میں خدمت کو زیادہ لازم کیا گیا۔

سیّد القوم خادمہم کا اشارہ قوم کے صحیح خدمت گزار کی جانب ہے وہی شخصیت ریاست میں سیادت کی حامل ہو سکتی ہے۔ جو ارکان خدمت کو جانتی ہو اور ارکان خدمت کے حقوق کی مکمل رعایت کرتی ہو۔ اور اس کی خدمت ریاست کے خود کفیل بنانے میں کفالت کی ضامن ہو۔ اس کا صاحب علم و ہنر ہونا۔ شفیق و غمگسار ہونا، محنت شاقہ کے ساتھ اظہار سیادت کرنا اور سختیٔ منزل کو اپنے لئے متاع راہ جاننا۔ اور خندہ پیشانی سے ہر حسن و قبح کا مطالعہ کرنا۔ بلیغ النظری اور بلیغ العلمی کے ساتھ حالات کا جائزہ لینا اور ریاست کے باشندوں کو اس سے متعلق اپیل کرنا اور عمل پیہم کے لئے صداقتوں کے ساتھ ان کی حوصلہ افزائی کرنا، جادۂ منزل پہ چلنے کے لئے اعمالِ حسنہ اور حکمتِ صالحہ کے ساتھ انہیں تازہ دم رکھنا اور اصولی طور پر اپنائے ریاست کو راہِ زیست پر مسلسل چلتے رہنے کی ترغیب دینا اور قوتِ عامہ کو تدبیر سیاست سے بروئے کار لاکر قوم کو ترقیات کی راہ پر چلانا، ریاست کے اخلاق داخلیہ کو صحت مندانہ نہج پہ قوی تر بنانا اور ان کو اسلام کے منشائے عظیم سے باخبر رکھتے ہوئے فرائض اسلام کی ادائیگی کے لئے کاربند رکھنا وغیرہ

اللہ حاکم مطلق ہے، وہ اپنے امور حاکم ریاست کو اپنی سنتِ الٰہیہ کی طرف راغب رکھنے کی تعلیمات اس طرح دیتا ہے کہ اس نے خدائے مطلق کے سامنے ریاست کے ایک ذرّے سے لے کر ریاست کی مجموعی حیثیت تک کا حساب دینا ہے اور گواہی بھی دینی ہے اور یہ کہ اس سے خدائے مطلق ریاست کے چھوٹے بڑے امور کے بارے میں باز پرس کرے گا۔

اس مقام پر حاکم مجاز اسلامی ریاست کے صحت مندانہ خوف و رجا کے ساتھ عدل و انصاف کو ہر شعبۂ زندگی پر جاری و ساری رکھنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ حاکم مجاز کی غلطی پر اس سے شدید باز پرس ہو گی اور اچھائی سے اس

کو بڑے بڑے انعامات سے نوازا جائے گا۔ اسلام نے قرآن مجید میں ایسی سیادت کو جو اسلامی ریاست پر مبنی ہو کہ ملک یا امیر یا حاکم یا سید القوم کے ناموں سے موسوم کیا ہے کسی طرح بھی ریاست کا حاکم جو ریاست پر مسلط ہو جائے چاہے وہ عامۃ الناس کی رائے سے سامنے آئے یا عامۃ الناس کو اپنی رائے میں لے لے یا حالات کی نزاکتوں کے پیش نظر ریاست کو بچانے کے لئے کسی صلاحیت کے ساتھ حاکم بن جائے۔ اس کا کسی صورت سے بھی سامنے آنا، اسلامی نقطۂ نظر سے تقسیم قسمت کے باب میں اللہ ہی کی طرف سے مامور ہونا ہوتا ہے۔ سوائے اس سیادت کے جو ظلم اور عدوان کے لئے بروئے کار لائی گئی ہو۔

خلیفہ مجاز ہونا یا حاکم مجاز ہونا اسلام کی نظر میں ریاست کا کفیل ہونے کے مترادف ہے۔

اللہ اپنی تعلیمات کے ذریعے اسلامی حکومت کو منشائے فطرت کے مطابق معرض وجود میں لاتا ہے تاکہ افرادِ ریاست کو ہمہ گیر تدبیر کی قیادت میں ریاست کو اس قدر ارتقائی حیثیت دی جائے کہ وہ اقوام عالم کے سامنے نمایاں ہو کر اپنی حکومت الٰہیہ ہونے کی شہادت بن جائے۔ یہ ریاست کی مجموعی حیثیت ریاست میں امن عامہ اور عدل و انصاف کے ساتھ سکونِ کامل پاتی ہے اور دوسری جانب اقوامِ عالم کو دعوتِ حق دینے میں فوزِ عظیم پاتی ہے۔

قرآن مجید اپنی تعلیمات میں اقتدار برائے اقتدار کا مخالف ہے اور اقتدار کی موجودگی میں اختلاف برائے اختلاف کا بھی مخالف ہے کیونکہ ان دونوں حالتوں میں ریاست بجائے تعمیر کے تخریب کا شکار ہو جاتی ہے۔ عوام الناس کی سیادت سید القوم کے ساتھ وابستہ ہے اگر سید القوم کامیاب ہو تو عوام کا کامیاب ہونا ایک لازمی امر ہے۔ سید القوم کے لئے اقتدارِ ریاست اور اختلاف ریاست

کا ہمہ وقت جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ صحت مندانہ اختلاف یا صحت مندانہ اقتدار کا توازن بگڑنے نہ پائے۔ یہی دو چیزیں حق و صداقت کی علمبردار ہوتی ہیں ان دونوں قوتوں میں قوی احتساب کا ہونا نظریۂ قرآن کے مطابق ہے۔ اختلاف کے بگڑنے پر جب وہ کسی ذاتی عصبیت کی بنیاد پر ریاست میں تخریب چاہتا ہو تو اقتدار کا عدالتِ عظمےٰ کی طرف سے احتساب کرنا ضروری ہوتا ہے اور اس حالت میں جبکہ اقتدار کسی بگاڑ کی صورت اختیار کر لے جو ریاست کی روحانی، مادّی اور ارتقائی قدروں کے لئے مہلک ہو صحت منداور تعمیر پسند اختلاف کا اس پر محاسبہ کرنا نظریۂ قرآن کے عین مطابق ہے کیونکہ اقتدار و اختلاف دونوں کا ریاست کی نظریاتی اور فلاحی تعمیر سے تعلق ہوتا ہے۔

ان دونوں کے وجود کا تعلق لازم وملزوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ ریاست میں اقتدار بالاستحکام لازم ہے اور اختلاف بالاحتیاط اس لئے لازم ہے کہ جس اختلاف میں احتیاط نہ ہو وہ اقتدار کا دشمن ہوتا ہے اور اسلام میں ایسی دشمنی جو اقتدار ملکی کے خلاف ہو اس کو سخت قبیح اور شنیع جرم قرار دیا گیا ہے۔

اسلامی ریاست میں آئینِ فطرت کی ہر جزو کل کو عدالتِ عالیہ کی دفعہ قرار دے کر حاکم و محکوم دونوں کے فیصلے کئے جاتے ہیں مگر قوتِ حاکمیہ ہر وقت عدالتِ عالیہ کے پاس ہوتی ہے اور خلیفۂ مجاز اس عدالت میں اپنے مدعی اور مدعا علیہ کے سامنے بالکل عوام کے مانند جواب دہ ہوتا ہے اور اس جواب دہی میں وہ اپنی خجالت محسوس نہیں کرتا۔ اس واسطے کہ اس کا ضمیر اس کی رہنمائی کرتا ہے کہ تو کسی انسانی عدالت کے سامنے جواب دہ نہیں بلکہ عدالت خدائے ذوالجلال کے سامنے جوابدہ ہو رہا ہے۔ جب حاکم و محکوم کے تصوّرِ ریاست میں اس قدر عدل گستریاں کارفرما ہو جائیں تو وہ ریاست کیوں کر حسنِ عمل اور حسنِ اخلاق کا نمونہ نہ بنے یہی اسلام کا

وہ طرز تمدن ہے کہ تہذیب سماویہ کی بنیاد ڈال کر قرآن مجید کے فلسفۂ ریاست کی ترجمانی کرتا ہے اور ریاست کے حاکم و محکوم کے نزدیک ریاست کا بنیادی تصور اَلْمُلْکُ لِلّٰہِ وَ اَلْحُکْمُ لِلّٰہِ، پر استوار ہو کر اوج کمال کی بلندیوں پر فائز المرام ہوتا ہے۔

صداقتِ ریاست اصول کے ڈھانچوں میں ڈھل کر صحت مند بن کر سامنے آجاتی ہے۔ اسلام کا یہی حسن عمل ہے جس کو اپنے اور بیگانے اپنانے کے لئے بے کل ہو جاتے ہیں۔ صدر اوّل میں ریاست کا تصور اس طرح عملی صورت اختیار کرتا ہے کہ اس کا حاکم مجاز اللہ کا رسول ہے جو فطری ہدایتوں کے ساتھ دینِ حق کا آئین ہاتھ میں رکھ کر سربکف لومۃ لائم سے بے نیاز ہو کر چٹائی پر بیٹھ کر جامۂ فقر زیب تن فرما کر میدانِ خدمت میں والہانہ انداز میں گامزن ہوتا ہے۔

اس آخری سیادت کل کا چہرہ میدانِ خدمت میں گرد آلود ہے مگر کیا مجال کہ دبدبۂ شاہی کے ساتھ کہیں شائبۃً بھی حکمرانی فرمائی ہو، مگر اس کے ساتھ ساتھ حکمرانی ازلی و ابدی صورت میں کائنات کے حکمرانوں کو شرماتی ہوئی فرائض حکومت بھی انجام دے رہی ہے۔ اس میں سید العالمین نے قلوب و اذہان پر حکومت حاصل کی۔ دوسرے حکمرانوں کے منصوبے جہاں ارب ہا روپیہ خرچ کرنے کے بعد بھی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتے تھے وہاں اس محبوبِ کل کے اشاروں نے وہ کام سرانجام دلوا دیئے۔ یہ دلوں پر حکومت کرنے کا نتیجہ تھا بظاہر حکومت کوئی بھی کر سکتا ہے، مگر دلوں پر حکومت کرنا تعلیمات قرآنیہ نے اعمال اسلامیہ کے ساتھ سکھایا۔ یہ انوکھی طرز حکومت صدر اوّل کی ریاست میں قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے انجام دی۔ بظاہر ریاست کو دفاعی صورت بھی

اختیار کرنی پڑتی ہے اور اس دفاع سے بالعموم جارحیت کے امکانات ہوتے ہیں۔ مگر اسلام میں دفاع اسلامی ریاست کے حق و صداقت کا امین ہوتا ہے اور وہ ہر وقت اس امانت کی تکمیل کیلئے چست و چوبند رہتا ہے مگر اس میں جارحیت مطلقاً نہیں ہوتی۔ اسلام میں ریاست کا تصور اپنی حدود کے اندر رہ کر عزت حاصل کرنا ہے مگر اس کی روحانی سنجیدگی اور استقامت ظاہری دفاع سے کہیں بلند و بالا ہوتی ہے۔ اسلامی ریاست میں حاکم قوم کو بلا وجہ ملک سے باہر پاؤں پھیلانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ بلکہ دوسری ریاستوں میں ظلم و عدوان بڑھ رہے ہوں تو ان مظالم کو تدبیرِ اسلام سے دور کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ط

"یعنی تم لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف حکمتِ اسلامیہ اور موعظتِ اسلامیہ کے ساتھ دعوت دو، اور اس کے بعد ان کے ساتھ اس حالت میں کہ وہ راہِ راست پر نہ آئیں تو جدال کرو وہ بہتر ہوگا۔

اس آیت میں ریاستِ اسلامیہ کو فرداً واجتماعاً دعوتِ حق دینے کے لئے تدبیر و حکمت کے ساتھ بلانے کی تعلیم دی گئی ہے اور پھر دوسری حیثیت قولِ جمیل کو دی گئی ہے یعنی اسلام کی میٹھی میٹھی باتوں کے ساتھ جو حقائق سے ہوں۔ دعوت دو۔ یہاں حکمت و موعظت دونوں کو بیک وقت یا مختلف حالت میں پیش کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

حکمت میں خاموشی، تقریر، غلبۂ حق، سامانِ خدمت، جذبۂ محبت، ترحم صلۂ رحمی، بیماروں کی خدمت، جاہلوں کی تعلیم، مسافروں کی خدمت، مہمان نوازی خندہ پیشانی، شفقت و رافت، عفو و درگزر، عدل و انصاف، جلال و جمال،

ترہیب و ترغیب، سفر و حضر، حسنِ مجلس، حسنِ تجارت، حسنِ حکومت، حسنِ کلام اور صبر و استقامت سب داخل ہیں۔ موعظتِ حسنہ میں اسلامی پند و نصائح جملتہً شامل ہیں اور جَادِلْهُم کو دعوت حق کے لئے تیسرا مقام دیا گیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی تعلیمات انسانیت سے جدال نہیں چاہتیں بلکہ وہ حکمت اور موعظت کے ساتھ ہی انسانیت کو عدل و انصاف کی تعلیم دے کر اپنا ہمنوا بنانا چاہتی ہیں۔ حکمت و موعظت کو ریاست اسلامیہ یا اس کے امراء اگر صحیح معنوں میں اختیار کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ بلا جدال وہ دوسری ریاستوں کو اپنا ہمنوا نہ بنا سکیں۔ یہی وجہ تھی اخلاقِ اسلامیہ نے کروڑوں دلوں کو جدال و قتال کے بغیر جیت لیا۔

بدقسمتی سے جب اسلامی ریاستوں پر کوئی بُری نظر ڈالے یا نقص امن کا باعث بنے اور حملہ آور کی صورت اختیار کرے یا وہاں کی انسانی آبادی پر بار بار ظلم ڈھائے۔ ایسی حالت میں ان کو پیغام حق دینا اور پیغام انصاف دینا اسلامی ریاست کا فریضہ ہوتا ہے۔

اسلام میں حملہ آور سے بچنے کیلئے دفاع کیا جاتا ہے

اسلامی ریاست کو حملہ کرنے میں پہل کرنے کی قطعاً اجازت نہیں بلکہ حملہ آور سے بچنے کے لئے دفاع کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

ایسی حالت میں ریاست کے ہر باشندے پر (جو جہاد کی صلاحیت رکھتا ہو) جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ بہرحال اسلامی ریاست کا حاکم خلیفہ ہو یا مطلق العنان بادشاہ یا دور حاضر کی صورت کا صدر یا وزیر اعظم ہو بہر صورت اس کو صورتِ اسلامیہ کی تعمیل میں حکمرانی کرنی ہو گی۔ ان تینوں صورتوں میں حاکم قوم کو ایسا مطلق العنان ہو جانا جو خدائی تعلیمات سے برگشتہ ہو کر ریاست کی صلاحیتوں سے لاپرواہ ہو کر تعلیم و تربیت سے ہٹ کر، خوف و رجا سے بے نیاز ہو کر ریاست کی فلاح و بہبود سے مستغنی ہو کر اور خدمت انسانیت سے بے بہرہ ہو کر ریاست پر حکمرانی چاہیے

تو ایسی حکومت کو قرآن مجید کی نظر میں بے بنیاد قرار دیا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنی بنیادی حیثیت اسلامیہ سے ہٹ کر حکومت کرتا ہے۔ یہی حکومت اسلام کی نظر میں عوام کے حقوق غصب کرنے والی حکومت کہلاتی ہے۔

اسلامی ریاست میں اسلامی طرزِ حکومت شوریٰ پر قائم ہوتی ہے جس کو آج کی اصطلاح میں عوامی ریاست کی نمائندگی کرنے والی اسمبلی کہا جاتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اسلام کی شوریٰ میں نمائندہ قوم کا صاحب تدبیر اور صاحب حل وعقد اور صاحب نظر ہونا اور نمائندگی کے لئے تربیت یافتہ ہونا ضروری امور میں شامل کیا گیا ہے۔

اسلامی ریاست میں حاکم ریاست کا نجی طرز تمدن اور طرز تہذیب طرز معیشت اگر اسلامی اخلاق کا گہوارہ ہو تو عوام کے لئے رہنمائی کا باعث ہوتا ہے۔ اس کا صاحب استقامت ہونا، صاحب کلام، صاحب شجاعت ہونا اور مرد میدان ہونا اور ریاست کے لوگوں پر ہر طرح ممیز ہونا، اسلامی ریاست کی حوصلہ افزائی کے لئے بہت ضروری ہوتا ہے اس کے اشارات وکنایات بھی قوم کے لئے متاع ہدایت ہوتے ہیں۔ اس کا خفی وجلی طور پر ملکی حالات سے مطلع رہ کر انتظامات ملکی کو سرانجام دینا مؤکد ہوتا ہے۔ ان حالات کے پیش نظر وہ قوم کا مکرم ترین اور بزرگ ترین مقام حاصل کر لیتا ہے اور یہی اس کی آسودگی حکومت کا سبب بنتا ہے۔

بغیر ان امور کے وہ حکمرانی میں آسودگی نہیں پا سکتا۔ اسلام کی مجلس شوریٰ اپنے صدر یا امیر یا خلیفہ قوم کے لئے صاحب الرائے ہوتی ہے۔ اس کی آراء پر وہ عوام کی حالت کا صحیح جائزہ لیتا ہے۔ اور اس جائزہ کے بعد احکام صالحہ کی تنفیذ کرتا ہے۔ اس کی بہت بڑی ذمہ داری ابنائے ریاست کے لئے ہوتی ہے کہ ہر فرد اپنی حالت میں مطمئن ہو کر ریاست کے امور میں محنت شاقہ کے ساتھ حصہ لے۔ صدر قوم کی اس محنت شاقہ کا نتیجہ بین الاقوامی سطح پر قوم کو معزز بنا دیتا

ہے۔ اس کا یہ بھی فریضہ ہوتا ہے کہ قوم کے اعلیٰ اعمال کے ساتھ آنے والی نسلوں کے لئے تاریخ مرتب کرے جو حاکم اعمال صالحہ کے ساتھ تاریخ مرتب نہیں کر سکتا وہ آنے والی نسلوں کا مجرم ہوتا ہے۔

اسلام کا سلسلۂ ریاست قیامت تک کی حدوں سے وابستہ ہے۔ ہدایت کی باریکیوں کو واضح تر کرنا بھی اس کے فرائض میں داخل ہے تاکہ آنے والی نسلیں آسانی کے ساتھ ان خطوط پر چل کر مزید ترقی کر سکیں۔ حاکم قوم کے لئے جدید تقاضوں کو سمجھنا اور اپنی قوم کو جدید تقاضوں کے مطابق دعوت فکر و عمل دینا اشد امور میں سے ہے جو حاکم اپنی قوم کو جدید ترین تقاضوں سے بہرہ ور نہیں کر سکتا تو گویا وہ ریاست کو ناگہانی موت کے لئے تیار کرتا ہے۔

قرآن مجید اسلامی ریاست میں صنعت و حرفت کو فروغ دینے پر زور دیتا ہے اور ہر زمانے کے ان جدید تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ان جملہ حالات سے دوچار ہونے کی تعلیم دیتا ہے جو فکر انسانی کی کوششوں کے نتیجہ میں جدید صورت میں رونما ہو کر سامنے آ چکی ہیں اور جس سے "انسانیت علیٰ منہاجِ فطرت" استفادہ کر رہی ہے۔ قرآن مجید ان سب کو حاصل کرنے کی نشان دہی کرتا ہے۔

مثال کے طور پر اقوام عالم کی زندہ ریاستوں نے زندہ معاشرت کے ساتھ میدان حکمت اور میدانِ صنعت و حرفت میں جن چیزوں کی تحقیق کی وہ تحقیقات عملی صورت میں پوری انسانیت کے سامنے موجود ہیں اور روبہ عمل ہیں سفر و حضر میں کام آ رہی ہیں۔ تجارت، صنعت و حرفت، زراعت، بر و بحر اور فضاؤں میں متشکل حیثیت میں متحرک نظر آتی ہیں۔ قرآن مجید نے ان سب کی نشاندہی کر دی ہے اور بار بار سخّر کے الفاظ ہر چیز کے ساتھ مربوط فرما کر تسخیر کائنات کی دعوت دی۔ چونکہ یہ جملہ سامانِ زیست جو عقل انسانی نے مہیا کئے۔ ریاست کے

عوام کی آسائش کے کام آنے والے ہیں۔ اس واسطے ریاست کے انتظامات میں جدید تقاضوں کو شامل کرنا حکومت کی حسنِ کارکردگی کا ایک نمایاں حصہ ہے لہٰذا اسلامی ریاست کے تصور میں اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ہر وہ چیز جس کو حاصل کرنا منشائے ریاست میں داخل ہے۔ اس کو تصرّف میں لانا ریاست کے فرائض میں داخل ہے۔

ریاست ایک مجموعی قوت کا نام ہے جو مجموعی فکری قوت انسانیہ کے ساتھ محیر العقول کارناموں سے دنیائے انسانیّت کو اسلام کی طرف مخاطب کر سکتی ہے فلسفۂ ریاست حسنِ انتظام کے ساتھ علم و عمل کو بروئے کار لانے کا ضمنی نام ہے ریاست کی امامت حکمران کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اس واسطے وہی مرجع الحالات ہوتا ہے اور اس کی ذات اپنے دفاع اور جملہ کارکردگی کے ساتھ مرجع الحالات ہوتی ہے۔ قوم کی مایوسی اور امید کا منبع وہی ہوتا ہے۔ تمام اخلاق اور بداخلاقیوں کی ذمّہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے۔

قرآن مجید کا فلسفۂ ریاست خلافتِ ارضی پر مختلف حالتوں میں ترجمان ہوتا ہے۔ اس واسطے کہ خلافت کبریٰ کا مجاز انسان ہے اور اس خلافت کبریٰ کی انجام دہی کے لئے اُسے تقویٰ کے ساتھ حکمرانی کرنے کی تاکید کی جاتی ہے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ط

کائنات ارضی پر تصرفات حاصل کرنے کے لئے ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو جملہ مسمّیات کا علم عطا فرمایا گیا۔

اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ قرآن مجید کی تشریحات میں مخلوقات کی تشریح انسان کے لئے ضروری ہوئی۔ علم الٰہی بہ اندازِ الہام کلام کی صورت میں اور نصاب تعلیم کی صورت میں انسانیّت کو دیا جاتا ہے مگر اس کی صورت مختصر ہوتی ہے۔ اور

اَسْمَاءَ كُلَّهَا میں کتاب زندگانی کی ظاہری و باطنی صورت اور عالمین کی ظاہری اور باطنی صورت کے ساتھ صدر یا خلیفہ کے سامنے رونما ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد انہیں استخلاف ارضی کا سزاوار قرار دیا جاتا ہے۔ اسی واسطے علم الاشیاء کی تعلیم و ترویج کا ریاست میں اہتمام کرنا حاکم ریاست کے فرائض میں داخل ہے۔ سائنس کی تمام تر معلومات کا ثبوت اس آیت سے میسّر آ جاتا ہے

قرآن مجید کا آئین ریاستِ اسلامیہ اور پوری انسانیت کو ریاست اسلامیہ کے اعمال کے ساتھ اپنی جانب دعوت دیتا ہے۔ قرآن مجید چاہتا ہے کہ اس کے پیروکار "انفس و آفاق" پر مسلّط ہو کر خدا کی حکمرانی مطلق کا غلبہ ثابت کریں۔

موجودہ طرز صدارت ہی قرینِ خلافت ہو سکتی ہے

چونکہ دورِ حاضرہ میں خلافتِ اسلامیہ کی اصلی حیثیت بظاہر معدوم العمل ہے۔ اس واسطے دورِ حاضرہ کی اسلامی ریاستوں کے لئے سیادت کے انتخاب پر طرز صدارت کی حکومت ہی قرینِ خلافت ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ اس میں بہ نسبت دوسری جمہوریتوں کے ضوابط زیادہ ہیں اور یہ مجموعہ قوت بننے کی ایک اچھی صورت بن سکتی ہے۔

آج اسلامی ریاستوں کے صدور رائے عامہ سے سیادت حاصل کرتے ہیں یا نزاکتِ حالات کے مطابق رائے عامہ کو ہمنوا کر لیتے ہیں

ان دونوں صورتوں میں وہ عوام کے دلوں کی ترجمانی کر سکتے ہیں۔ اگر تھوڑی تدقیق کے بعد وہ اپنی شوریٰ یعنی نمائندہ اسمبلیوں کو تربیتِ فکر و عمل دیں جو اسلامی مزاج کے مطابق ہو، تو صورتِ خلافت صورتِ صدارت میں بروئے کار آسکتی ہے۔ اور یہی صحت مندانہ طرزِ حکومت اپنی اپنی ریاستوں میں خلافت کیلئے راہیں مہیا کر سکتی ہے۔

اس کے لئے قرآن مجید کی تعلیمات کو صحت مند مفکّرین کے حوالے کرنا ضروری ہے۔ اگر ریاست ہائے اسلامیہ متحدہ طور پر صالح مفکّرین اسلام پر مشتمل ایک مرکزی تحقیق گاہ بنالیں۔ اور اس کے ذریعے قرآن مجید کے ان احکام کو یا اس کی جملہ دفعات کو اس کی ترجمانی کے مطابق ہر زمانہ کے حالات پر منطبق کرتے ہوئے عالمِ انسانیّت کے سامنے پیش کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان انسانیّت کی امامت پر فائز نہ ہوں۔

اسلامی ریاست میں جمہوری پارلیمانی طرزِ حکومت ہو یا صدارتی طرزِ حکومت۔ دونوں میں اسلامی مزاج رکھنے والی شوریٰ کی ہمہ وقت ضرورت ہے زمانہ کی مجبوریوں کے پیشِ نظر حالتِ اضطرار میں اگر طرزِ خلافت نہ میسّر آسکے تو بھی طرزِ خلافت کے نظریہ کو اسلامی ریاست کے اکابر اور عوام کے ذہنوں میں محفوظ رہنا چاہیئے۔ ایسی حالت میں جمہوری پارلیمانی طرزِ حکومت یا صدارتی طرزِ حکومت دونوں کو عوام کی رائے پر حکومت مرتّب کرنی چاہیئے۔ اور ان کا آئین

اور منشور بالکل کتاب و سنّت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ تاکہ ریاست اندرونی اور بیرونی طور پر اسلامی ریاست کو منوا سکے۔ اگر ریاست اسلامیہ، اقدارِ عدالت اور اسلامی طرزِ حکومت کو نہ منوا سکے تو یہ اس کی اسلامی کم فہمی پہ منتج ہوگا خدانخواستہ کسی طرزِ حکومت سے بھی اسلامی ریاست کی عملاً ترجمانی نہ کر سکیں تو یہ مسلمانانِ عالم کی بدقسمتی ہوگی۔

حالانکہ اسلامی حکومتوں نے اعلیٰ سیاسی انتظامات کے ساتھ حکومت کرنا انسانیّت پر ثابت کر دیا تھا۔ متاخرین مسلمانوں نے موجودہ دوران میں مغربی طرزِ حکومت کو اپنانا شروع کر دیا جس سے اسلامی ریاست میں جانبیّت کی صورت پیدا ہوگئی اور مسلمانوں کو اس تواتر سے الگ ہو کر ریاستِ اسلامیہ کے سمجھنے میں زیادہ اُلجھنا پڑا۔ اس الجھاؤ نے ہمیں منزل سے کافی دور کر دیا ہے۔ جب تک ازسرِنو پھر طرزِ خلافت کی طرف مسلمانانِ عالم متوجہ نہ ہوں گے وہ آئے دن غیر اسلامی رسومِ حکومت کا شکار رہوتے رہیں گے اور آنے والی نسلیں سیاست کے حق و باطل سے بے خبر رہ کر اسلامی تہذیب و تمدّن سے محروم در محروم ہوتی چلی جائیں گی اور اس کی ذمّہ داری اکابرینِ اسلام پر ہوگی۔ مناسب ہے کہ اسلامی ریاستیں پارلیمانی طرزِ حکومت یا صدارتی طرزِ حکومت کے ساتھ عوام کی رائے پر حکومت کریں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی اسمبلیوں میں تربیت یافتہ افراد کو شامل کریں اور آئین میں انہی لوگوں کو نمائندگی کا انتخاب لڑنے کی اجازت دی جائے جو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں سیاست اسلامی اور حالات زمانہ کے مطابق سیاست کی عملی فضیلت پا چکے ہوں۔ اگر اسلامی ریاستیں اسمبلیوں کو اسلامی شوریٰ کی حیثیت نہ دے سکیں گی تو ایسی حالت میں خطرناک قسم کے حالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں جو اسلامی تعلیمات کے لیے مہلک ترین شکل اختیار کر سکتے ہیں۔

اگر صدارتی طرزِ حکومت جو قرینِ خلافت ہے عوام سے رابطہ نہ قائم کر سکے۔ اور مذکورہ دستور العمل کے مطابق رائے نہ لے سکے تو یقیناً صورت حال سخت ترین ہو جائے گی اور پھر ایسے حالات کا تحمل معدوم ہو جائے گا۔ چونکہ ملک کے عوام کا کندھا اتنے نازک ترین حالات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ دونوں قسم کی حکومتوں کے صائب الرائے شوریٰ کے بغیر حکومت گراں بار ہو سکتی ہے ریاست اسلامیہ میں عوام کی قدر مشترک صرف اسلام ہے۔ اگر داخلی قدر مشترک پامال ہو جائے تو نظریات حکومت دوسروں سے مستعار لینے پڑیں گے جو بنیادی طور پر سخت ترین غلطی ہو گی۔

قرآنِ مجید اور مساوات

قرآنِ کریم اسلامی ریاست میں دولت کے غیر
متوازن ہونیکے خلاف ہے وہ امیر کو اسی وقت
امارت کا مجاز کہتا ہے جب وہ لوگوں کے لئے
نفع رساں ہو اور اس کی امارت پوری ریاست
کو آسودہ حال کرسکے ایسے اُمراء کے متعلق قرآنِ کریم
بشارت دیتا ہے کہ وہ دُنیا و عُقبیٰ میں خوشحال رہینگے

قرآنِ مجید آئینی اعتبار سے اتنی بلندیوں سے انسانیت کے ساتھ ہم کلام ہوتا ہے اور اس کی رفعتیں انسان کو اتنا اعلیٰ وارفع بنانا چاہتی ہیں کہ وہ اپنی حقیقی عظمتوں سے ہمکنار ہو سکے اس کیلئے وہ بنی نوع انسان کے سامنے کسی جُنبہ داری سے کام نہیں لیتا بلکہ وہ انسانیت کو ایسی راہوں پر گامزن کرنا چاہتا ہے جن پر انسان کو ہر وہ سعادت مل سکے جو اُس کیلئے ہر حال میں مُفید ہو۔

قرآن کی بے مثال تبلیغ پوری انسانیت سے حُسنِ سلوک روا رکھتے ہوئے جماعت بندی سے میدانِ عمل میں آنے کی دعوت دیتی ہے وہ بنائے توحید و رسالت کے ساتھ ترتیب وار انسانی ضرورت کے مطابق اس کے انجام پر نظر رکھتے ہوئے ایسے اعمال کی تلقین کرتا ہے جو انسانی تکرّم کے مطابق نیک ہوں انسان کیلئے خوش کُن ہوں اور وہ واقعتہً اس سے طمانیت پا سکے۔

وہ انسانیت سے کوئی مستعار سودا نہیں کرتا بلکہ حصولِ مقصد کی راہ میں ہاتھوں ہاتھ سلسلہ وار منزل بمنزل جزاء کا وعدہ کرتا ہے اس کی تعلیم ذہنِ انسانی کو ہر میدان میں مطمئن دیکھنا چاہتی ہے۔

قرآنِ حکیم اجتماعِ انسانی کی آسودگی کیلئے حقائق کو دلوں پر وارد کرتا ہے تاکہ ہر ظاہر ہونے والا عمل دل کی گہرائیوں سے نکل کر عملِ خیر بن سکے وہ ہر اس بات یا عمل کی ضرور نشان دہی کرتا ہے جو مفادِ عامہ سے متعلق ہو اور اس کے ساتھ ہی ہر اس قول و فعل کی بھی نشان دہی کرتا ہے جو انسانی مفاد کے خلاف ہو۔

قرآن مجید ہر اچھے عمل کی تعریف اس کی مہلک ضِد کے ساتھ کرتا ہے تاکہ عامل اعمال اچھائیوں کا انتخاب کرتے ہوئے اس کے مقابل مہلک اضداد کا تعارف

حاصل کرتا چلا جائے اور برائیاں اس کے ذہن نشین ہو جائیں تاکہ نیکیوں کی راہ میں دوبارہ بھولے سے بھی ان برائیوں کے نزدیک نہ پھٹک سکے۔

قرآنِ مجید بنیادی نیکیوں سے آغاز کرتا ہے اور ان نیکیوں کے استحکام کے لئے مدافعانہ انداز اختیار کر کے نیکی تلقین بھی کرتا ہے۔ وہ کبھی کسی حال میں یا کسی جگہ پر اشارۃً یا کنایۃً بھی برائی کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔

قرآن حکیم اتنی ضخیم کتاب ہونے کے باوجود کسی محل پر بھی اس میں سے کوئی شخص یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ اس نے کسی کے ساتھ برا سلوک روا رکھنے کی اجازت دی ہو۔ یہاں تک کہ وہ اپنے ہر مخاطب کو اپنے دل میں وسوسے کے طور پر برا خیال کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتا بلکہ وہ ناکردہ گناہوں سے بھی مجتنب رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

قرآنِ کریم من حیث المجموع نیکیوں کا مخفی خزینہ ہے اور سراسر برائیوں کا قاطع۔ وہ انسانی معاشرہ کو ہمہ وقت نیکوکار ہونے کی تعلیم دیتا ہے اور دیارِ انسانیت سے خفی و جلی بدیوں کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ انسانیت کو اجتماعاً نیک بنانے کا مدعی ہے قرآنِ حکیم کی یہ تقسیمِ عمل مساویانہ ہے۔ وہ صرف حق و باطل کے امتزاج کے ساتھ مساوات نہیں چاہتا۔ وہ مساوات کی بنیاد تقویٰ پر رکھتا ہے اور یہ تقویٰ ہر عامل قرآن کے مبادیات میں کارفرما ہو کر اسے جملہ نیک اعمال کی ادائیگی کا حکم دیتا ہے۔ یہ ترتیب تقسیم فطرت کے ازلی دستور کے عین مطابق ہے۔ وہ کسی چیز کی نوعیت کو اعمال کی ادائیگی میں پامال نہیں کرتا بلکہ ہر مزاجی نوعیت، شکلی نوعیت اور حرکی نوعیت کو احکام کا پابند بناتا ہے۔ مگر اس کا منشا یہ ہے کہ نوعیت کے اعتبار سے میدانِ عمل میں ہر فرد یا جماعت یا ریاست کا تعارف اس کے اعمالِ صالحہ کے ساتھ کرایا جائے اور عملی دنیا میں امتیازات حاصل کرنے کیلئے وہ اپنے

ہر مخاطب کو صفِ اوّل حاصل کرنیکی تاکید کرتا ہے۔

اس حُسنِ تبلیغ سے صراطِ مستقیم کا صحیح سُراغ مل جاتا ہے اور وہ روشن ہو جاتی ہے۔ دریا کی روانی امواج پیدا کرتی ہے اور موج کی نوعیّت روانی سے متعلق ہو کر بھی موج ہی رہتی ہے۔ دریا دریا رہتا ہے۔ دونوں ایک ہی جہان میں اپنے عمل کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مگر روانی کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنے ساتھ مدوجزر پیدا کرتی ہے۔ ہواؤں کے طوفان مختلف شکلوں میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ نشیب و فراز میں ان کا یہ کردار مسلسل اپنا کام سرانجام دیتا ہے۔ جغرافیائی حالات کے مطابق ہواؤں کے پیچ و خم حاصل کرنا، اس کا نرم و سخت ہونا، اس کی نوعیّتِ اصلیہ میں کوئی تغیر پیدا نہیں کرتے۔ اس طرح کائنات کی تمام محرک روانیاں اپنے تسلسل کے ساتھ ہزار نوعیّتیں اختیار کرتی ہیں، مگر مقصد ایک ہوتا ہے۔

طلُوعِ شمس کی نوعیّت صُبح۔ نوعیّتِ نصف و نہار اور نوعیّتِ شام اگرچہ مختلف ہیں، مگر ان کا مقصد ایک ہے۔ ان جُملہ واردات کا تعلق اپنی مناہج پر چلنا ہوتا ہے اور اپنے مقصد کو پُورا کرنا ہوتا ہے۔ ان کے اُتار چڑھاؤ سے ان کے مجوّزہ مقصد میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ ان کی یہی رواداری ان کی صداقت کی گواہ ہوتی ہے۔ مختلف مقامات پر اشیاءِ عالم کو ان کی نوعیّت کے مطابق تربیت دی جاتی ہے۔

بالکل اسی طرح قرآنِ مجید کی تعلیمات پُورے عالم میں جغرافیائی حیثیات کے پیشِ نظر پُورے مزاجِ انسانی پر نیکی مسلط کرنا چاہتی ہیں۔ اس نے اس تقسیمِ عمل میں خُدائے لم یزل کی ربوبیّت میں اس کی رحمانیت کو اور اس کی حکومت کو پوری انسانیت کے لئے شفیق قرار دیا ہے۔ دلیل کے طور پر وہ خدا کی حکومت

میں اس کی رحمانیت کو ہر چیز کے لئے مساوات کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اس کی مخلوقات میں سے کوئی ایسی شے باقی نہیں بچتی جو اس کے احاطۂ رحمت سے باہر ہو۔ اس کے جاری کردہ کائناتی عوامل اس کے منشاء کے مطابق انسانیت پر یکساں طور پر اپنے عمل کو جاری رکھتے ہیں۔ اس کی رحمانیت کی یہ مثال مخاطب کیلئے مساوات پیدا کرنیکی دلیل ہے۔

سورج کسی ایک انسان کے لئے طلوع نہیں ہوتا، کسی شاہی محل ہی کو منور کرنا اس کا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ وہ ہر گوشۂ عالم اور اس کی ہر چیز کو منور کرنے کے لئے طلوع ہوتا ہے۔ ایک بے نوا دریوزہ گر کے جھونپڑے سے لیکر ایوانِ شاہی تک برابر ضیا پاشی کرتا ہوا غروب ہو جاتا ہے۔

آتش، آب، باد و خاک کے جملہ عناصر کائناتی عوامل میں داخل ہیں۔ جن سے انتظامِ کائنات مکمل ہوتا ہے اور ان کے عملی انتظامات میں چھوٹے اور بڑے کی تمیز نہیں ہوتی یہ سارے کائناتی عوامل خدا کی رحمانیت کا مظہر بن کر درسِ مساوات دیتے ہیں اور ان کے قدرتی منافعوں سے خدا کی مخلوق یکساں طور پر استفادہ کرتی ہے۔ کائنات اپنی قدرتی تقسیم کے ساتھ اسی نہج پر چلتی ہے جس پر اسے چلایا گیا ہے۔

یہ اس کی فطری عادت ہے جس میں وہ تغیر اور تبدل کرنے کی قطعاً مجاز نہیں بس اس کو خدمت کے لئے مامور کیا گیا ہے، جس خدمت کے لئے وہ مامور ہے۔ وہ اس سے سرزد ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔

قرآنِ کریم کا مخاطب تمام کائنات نہیں بلکہ اس کا مخاطب "انسان" ہے۔ منتشر اور مختلف نظریات نے انسانی برادری کو ایسے تعینات کے مقام پر لا کھڑا کیا ہے کہ وہ اپنے نظریات کے دائروں میں عالمی سطح پر نخوت پسند ہو گئی، یہی نخوت

پسندی قاتلِ مساوات ہے۔ ہر سر اپنے غرور کا متوالا ہو کر دوسرے کو نیچا دکھانے کی عادت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس سے انسانی معاشرہ طوائف الملوکی کا شکار ہو جاتا ہے، جو اپنے گرد و پیش بے دست و پا انسانیت کو محتاج پا کر خوش ہوتا ہے۔ انسانی معاشرہ کا طبقات میں تقسیم ہونا بھی اسی جرم کی پاداش ہے ورنہ انسانیت کبھی ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوتی۔

اولادِ آدم ایک ماں اور ایک باپ کی نسل ہو کر اختلافِ طبقاتی کا قطعاً شکار نہ ہوتی۔ مگر مفادِ نفسانیہ نے اس نخوت کے ساتھ اپنے لئے ہزاروں راہیں تجویز کیں۔ یہی نخوت و ناموس غرور کی صورت میں سامنے آیا اور تشہیرِ نفسی، اغراضِ نفسی اور مفادِ نفسی کا غرور باقی رہا۔ باقی نخوت و ناموس تکبر ہے۔ جس کی عادت ظلم و تعدی، بغاوت، خون ریزی اور مطلق العنانی ہے۔ اس کی موجودگی میں عوام درجۂ بہیمیت سے آگے نہیں بڑھ سکتے اور انسانی صلاحیتیں اِستکبار کی سخت چٹانوں کے نیچے دب کر پامال ہو جاتی ہیں اور انہیں کبھی اُٹھنے کا موقع نہیں ملتا۔

خُدا کی رحمت بھری آنکھوں نے اس نخوت و ناموس کے دیوتاؤں کو عامۃ الناس پر پیہم ظلم کرتے ہوئے دیکھا تو اپنے رحم و کرم سے قرآنِ مجید جیسا مکمل آئین انسانیت کو عطا فرمایا۔ اور اسی پر عمل پیرا ہونے کے لئے نوعِ انسانیت کی سب سے بڑی امین و صادق و مصدوق شخصیت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو منتخب فرما کر قول و عمل کے ساتھ راہِ عمل پر چلانے کیلئے مبعوث فرمایا۔ اور قرآن کریم کی مساواتی تقسیمِ عمل کو ساقیِ کوثر صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں میں دے دیا۔ یہ خدا کے امری عوامل میں حتمی عمل تھا جس نے اپنے پورے اعمال سے ثابت کر دیا کہ بڑائی خدائے لم یزل کیلئے ہے۔ استکبار اسی کی شان ہے۔ اس صفت کا سزاوار اللہ ربّ العزت کے سوا کوئی نہیں۔ اللہ تعالےٰ کے سوا جو استکبار کریگا ظالم ہو جائے گا۔

قرآنِ کریم اپنے مخاطب کو یا پیروکار کو ان تمام مفاسد سے بار بار بچاتا ہے جن سے غرور کی تخلیق ہو۔

انسان کی یہ نفسانی عادت ہے کہ جب اس کی صلاحیت آشکار ہو تو وہ اس پر غرور کرتا ہے یا اس سے کوئی حیران کن صلاحیت صادر ہو تو اس پر اس طرح حیرت کرتا ہے جیسے وہ خود اس کا خالق ہو۔ حالانکہ انسان اور اس کی جملہ صلاحیتیں اس کی اپنی تخلیق نہیں بلکہ خدا کی طرف سے اسے تفویض ہوئی ہیں جب ذہن انسانی مخلوقات کی صفات پر حیرت کرتے ہوئے اس کے پیدا کرنے والے پر حیرت نہ کر سکے تو لازمی طور پر حیرت کی بنیاد غلط ہو جاتی ہے اور بجائے اظہارِ عجز و نیاز کے انانیتِ نفسی کا اظہار شروع کر دیتا ہے۔ جس سے غرورِ نفسی کی نمود ہوتی ہے اور یہی غرور اپنی بڑائی کا سکہ منوانے کیلئے دوسروں کو چھوٹا دیکھنے کا متمنی ہو جاتا ہے۔ اور اس غرور سے انسانی مساواتی حقوق تباہ ہو جاتے ہیں۔ جن جن چیزوں سے غرور پیدا ہو سکتا ہے۔ ان سب کی قرآنِ کریم نے ذہنِ انسانی سے بیخ کُنی کرنے پر دلائل کے ساتھ زور دیا ہے۔ اگر قرآنِ کریم کے ان دلائل پر غور کیا جائے، تو ذہنِ انسانی ان خرابیوں سے نجات پانے میں خوشی محسوس کرے۔

غرور پیدا کرنیوالی چیزوں میں جوانی، حُسن، مال و دولت، جائیداد، علم و ہنر، حکومت، ریاکاری، حسد کینہ، برائے نام وضعداری، جسم، لالچ، عجبِ نفسی اور بخل وغیرہ وہ چیزیں ہیں جو اکثر غرور کا باعث ہوتی ہیں۔ حالانکہ یہی چیزیں صالح ہو کر خدمتِ انسانیت میں کام آ سکتی ہیں۔ اگر صالحیت کے راستے سے غرور، حسد، کینہ، برائے نام وضعداری، لالچ، بخل اور عجبِ نفسی کو ہٹا دیا جائے تو انسانیت کیلئے سراسر رحمت بن جاتی ہیں۔ اور یہی قبیح عاداتِ انسانی حسنات کے راستے میں آ کر اس پر افادیت کی راہیں بند کر دیتی ہیں۔

ان شنیع عادات کا سب سے زیادہ ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ مساوات کچل جاتی ہے مساوات کے کچل جانے کے بعد عوام الناس کی فریادیں ان کے سینے میں ڈبک کر رہ جاتی ہیں۔ یہی فریادیں بعد میں انتقامی نوعیت اختیار کر لیتی ہیں۔ اور یہ انتقام کچھ مدت کے بعد اتنی سخت صورت اختیار کر لیتا ہے کہ اس سے ایوانِ شاہی کے امن و آسائش میں بھی خلل واقع ہو جاتا ہے۔

یہ وہ خلل ہے، جس سے تمام رعونتیں لرزہ براندام ہو جاتی ہیں۔ اس خلل کا مطالبہ حصولِ مساوات ہوتا ہے۔ اگر اکابرینِ قوم حُسنِ مساوات کو عملی جامہ پہنانا چاہئیں تو کوئی وجہ نہیں کہ عوام کی زندگانیاں سطحِ انسانی پر نمودار نہ ہو سکیں اور اگر عوام سطحِ انسانی پر نمودار ہو کر آسودگی پالیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اکابرینِ قوم کی آسودگی مستحکم نہ ہو سکے۔ درحقیقت عوام کی آسودگی اکابر سے اور اکابر کی آسودگی کا استحکام عوام سے وابستہ ہو کر دیرپا ہو سکتا ہے۔

ان دونوں کا رابطہ مستقل آسودگی کی ضمانت ہوتا ہے۔ ورنہ آسودگی غیر متوازن ہو کر مفلوج ہو جاتی ہے۔ اس مفلوج زدہ آسودگی سے کوئی طبقہ یک طرفہ طور پر مطمئن نہیں ہو سکتا ہے۔

آسودگیاں ایک ایسا خزانۂ فطرت ہیں، جو ایک ایک کر کے انجام کار پھر انسانیت میں پھیل کر منتشر ہو جاتی ہیں۔ دولت و جاہ، حُسن و جوانی، علم و ہنر کسی ایک گھر کا ورثہ نہیں ہو سکتے بلکہ یہ چیزیں فطرت کے ہاتھوں میں ہمیشہ گردش کرتی رہتی ہیں جس کے ساتھ ساتھ جذبۂ انتقام بھی گردش کرتا رہتا ہے۔ گویا غیر متوازن آسودگی گردشِ لیل و نہار کے ساتھ چھوٹے بڑوں میں تقسیم ہوتی رہتی ہے جس کے ساتھ ساتھ جذبۂ انتقام بھی گردش کرتا رہتا ہے کیونکہ اس آسودگی اور انتقام کا چولی دامن کا رشتہ ہے قرآنِ حکیم آسودہ حال لوگوں سے بے خبر نہیں ہونے دیتا وہ ایسی

مساوات کا حکم دیتا ہے جس میں وجود بیادت کی بھی ضمانت اور سیادت کے ساتھ خدمت کی ضمانت اور خدمت کے ساتھ عوام النّاس کی فلاح و بہبود کی ضمانت ہو وہ بلا محنت کسی کو مزدوری کا حق نہیں دیتا وہ کسی طرف سے اکتسابِ مال میں رخنہ اندازی نہیں چاہتا بلکہ ہر انسان اس کی اطاعت میں اپنی صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ سامانِ زندگی مہیا کر سکتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی وہ اس کے مصرف کے صحیح فرائض بتاتا ہے۔

قرآنِ کریم کے معین کردہ مصرف کے خلاف جو بھی دولت جمع یا خرچ کی جائے وہ اُسے بخل سے تعبیر کرتا ہے اور بخل کی سزا تجویز کرتا ہے۔ اسے دُنیا اور آخرت کے ہولناک انجام سے مطلع کرتا ہے۔ بے جا دولت جمع کرنیوالے بخیلوں کو یہ وعید سُناتا ہے۔

فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ

"کہ اُن کی پیشانیوں کو اور اُن کے پہلوؤں کو اور انکی پیٹھوں کو دولت سے داغا جائے گا" اس قسم کی بہت سی وعیدیں ایسے لوگوں کے لئے وارد ہوتی ہیں۔

قرآنِ حکیم کا اسلوب بیان انسان کی صلاحیتوں کی تفہیم پر اس طرح متواتر اپنے بیان کو جاری رکھتا ہے جس سے ہر گام زندگی پر کوئی صاحبِ مال و دولت انفاق سے بے خبر نہ ہو سکے۔

قرآنِ کریم کی اس تفہیم سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلامی ریاست کے غیر متوازن ہونے کے خلاف ہے وہ امیر کو اسی وقت امارت کا مجاز کہتا ہے جب وہ لوگوں کے لئے منفعت رساں ہو اور اس کی امارت اپنے ساتھ بہت سے لوگوں کو آسودہِ حال کر سکے ایسے امراء کے متعلق قرآن کریم بشارت دیتا ہے کہ وہ دُنیا و عقبیٰ میں خوشحال رہیں گے ایمان بالغیب و اقامت الصلوٰۃ کے بعد وہ انفاق

مال پر زور دیتا ہے ارشاد ہوتا ہے :۔

وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

"یعنی اہلِ ایمان وہ ہیں جو توحید و رسالتؐ پر ایمان لانے کے بعد نماز قائم کریں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا اس کی راہ میں خرچ کریں۔"

اس آیت میں انفاقِ مال کی کسی واحد مال کے ساتھ تخصیص نہیں کی بلکہ وہ صلاحیت جو اللہ نے اہل ایمان کو دے رکھی ہے اس میں سے وہ اللہ کی راہ میں خرچ کریں اللہ ایسے لوگوں کو :۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

کی بشارت دیتا ہے یعنی یہی وہ لوگ ہیں جو صحیح راہ پر ہیں اور یہی فلاح دارین پانے والے ہیں۔ اس فلاح کا تعلق دُنیا کی آسودگی اور عقبیٰ کی فلاح پر مرتّب ہوتا ہے۔ یقیناً وہ لوگ جو دُنیا میں اپنی صلاحیتوں کو عوام کیلئے مصروفِ خدمت رکھتے ہیں۔ عوام کی مصیبت میں ان کو امداد مہیا کر کے دُنیا میں اجتماعی خوشی حاصل کرتے ہیں۔ عقبیٰ میں اپنی سخاوت کی بناء پر اپنے عوام کے ساتھ نجات پائیں گے۔

قرآنِ کریم میں ایسے تصوّر کو بھی ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ جس میں عوام کے خلاف صرف اپنی ذات کے لئے فلاح کی تمنا کی جائے۔

قرآنِ کریم انجام کار ان ہی امراء کو امیر کہتا ہے جو عاقبت میں نیک لوگوں کے ساتھ نجات کے خواہش مند ہوں۔

قرآنِ کریم اس طرح ساری دُنیا کے لئے پیغام فلاح ہے۔ جس طرح خدا ساری دُنیا کے لئے مربّی ہے اور امیر اوّلین و آخرین حضرت سرورِ کائنات۔ فخر موجودات محمدؐ مصطفٰے۔ احمدِ مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلّم بھی سنّت اللہ کے مطابق قرآنی ہدایات کی تعمیل میں پوری انسانیت کے لئے فلاح و نجات کے پیامبر بن کر

تشریف لائے۔

ہر آئین کا وجود آئین ساز سے متعلق ہو کر عملی جامہ اختیار کرنے کے لئے ایک کامل علمبردار چاہتا ہے۔ کوئی آئین کسی سچے علمبردار کے بغیر جامۂ تکمیل نہیں پا سکتا۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے جس طرح چاہا اسی طرح سرورِ کائنات سید الکونین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کو عملی جامہ پہنایا۔ قرآنِ آخری آئین ہونیکی حیثیت سے عملی میدان میں علمبردارِ حق و صداقت کے ذریعے اپنے اعمال کی تکمیل کرا چکا ہے۔ جس کی مثال قرونِ اولیٰ نے بہ احسن پیش کر دی تھی۔

قرآنِ مجید کے آخری نظریہ ہونے کی دلیل یہ ہے، کہ اقوامِ عالم نے جو جو نظریات تجویز کئے ان میں سے کسی طرح بھی فطری نیکی کی رہنمائی نہ ہو سکی اس ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ دُنیا میں نظریات کے جتنے علمبردار گذرے ہیں اور موجود ہیں انانیتِ نفسی کے شکار ہوئے ہیں۔ وہ مساوات کی داغ بیل ڈالنا چاہتے ہیں مگر انجام کار وہ نفس کی تلخ اور خشک آبیاری کے ساتھ مُرجھا کر خشک ہو جاتے ہیں۔ ان کی بناءِ مساوات خوفِ خُدا پر نہیں رکھی جاتی بلکہ خواہشاتِ نفس پر تعمیر کی جاتی ہے اور نفس ایسی شاخِ نازک ہے جس پر کبھی آشیانہ تعمیر نہیں ہو سکتا اسے خجالتِ نفس کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ اشتراک پسندوں نے مساوات کے جو خدوخال بیان کئے ہیں اور جن پر وہ مساوات کو کھڑا کرنا چاہتے ہیں اگرچہ بظاہر وہ بڑے جاذبِ نظر ہیں مگر بباطن ان کی اصل نفس ہے۔

یہ قاعدہ کُلیہ ہے کہ جو چیز جہاں سے اُٹھتی ہے وہیں ختم ہو جاتی ہے۔ دُنیا کے جس کونے سے سفر کیا جائے انجام کار مکمل سفر اسی پر اختتام پذیر ہوتا ہے یہ بات آج کی سائنس نے بھی ثابت کر دی ہے۔ حکمائے وقت نے بھی اسی بات کو ثابت کر دیا ہے اور ان کی جانچ پڑتال میں یہ چیز آ چکی ہے کہ بُرائی کا انجام

برائی ہوتا ہے اور نفس ہر قسم کی پریشانیوں کا شکار بھی ہو سکتا ہے اور فانی بھی ہے۔
نفس ایک غیر مطمئن شے ہے جو سارے جہاں کی آسودگیوں کے ساتھ بھی مطمئن نہیں ہو سکتا اور صاحب ایمان صرف ایک نعمت سے بھی مطمئن ہو سکتا ہے۔
کیونکہ صاحب ایمان شکر گزار ہے۔ جتنا زیادہ سے زیادہ اسے ملتا جائے گا وہ شکر گزاری میں اسے وصول کرتے ہوئے اپنے جیسے انسانوں تک فیوض و برکات پہنچاتا ہوا مقصودِ مطلق کی رضا چاہے گا۔ قرآن کریم ہدایت دینے میں مساوات اختیار کرتا ہے اور اعمال کی تقسیم میں بَعْضُهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ کے ساتھ کرتا ہے بڑوں کے ذمہ بڑی ذمہ داریاں اور چھوٹوں کے ذمے تعمیلِ حکم کی ذمہ داری عائد کرتا ہے۔ اس اطاعت شعاری سے جو منافع میسّر آئے اسے یکساں تقسیم کرتا ہے۔ بارش کا پانی جس طرح نشیب و فراز دونوں پر برستا ہے قرآن مجید اسیطرح اکابرین کی صلاحیتوں کو چھوٹے بڑوں میں تقسیم کرنیکی تلقین کرتا ہے۔ اس نے خدا کی حکومت منوانے میں بنی نوع انسان کو آواز دی۔ تسلیم کرنیوالوں کو اپنے آئین کا مطیع قرار دیا اور نہ تسلیم کرنیوالوں کیلئے دعوت کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھا۔ اس کی سخاوت اور مساوات کا یہ عالم ہے کہ اپنے اطاعت گزاروں کو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کی تلقین کرتا ہے۔ وہ رب المسلمین ہی نہیں بلکہ وہ رب العالمین ہے دنیا کا کوئی بھی آئین ساز انسان ایسا آئین نہیں دے سکتا جو اپنے پیروکاروں کیلئے مربّی ہونے کا عوام الناس کی عمومیت کی تربیّت کے ساتھ دعوی کرے۔
قرآنِ کریم جہاں اپنے آپ کو هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کہتا ہے وہاں وہ ببانگِ دہل اعلان کرتا ہے کہ میں هُدًى لِّلنَّاس بھی ہوں جس کا ترجمہ یہ ہے کہ میں بالتخصیص اطاعت گزاروں کے لئے ہدایت ہوں اور بالعموم میرا دروازہ پوری انسانیت کے لئے کھلا ہے۔ اس کی بہتر مثال یہ ہو سکتی ہے کہ زرخیز زمین کیلئے بارش کا

فائدہ خاص ہوتا ہے اور غیر زرخیز زمینوں کے لئے عام ہوتا ہے۔

یہاں بھی قرآنِ حکیم نے تخصیص و تعمیم کے ساتھ اپنی ہادیانہ مساوات کا ثبوت پیش کیا۔ اس کے بعد کسی مقام پر اپنے پیروکاروں یا معاشرۂ انسانی کو یہ سہولت نہیں دیتا، کہ وہ عجب سے کام لیں وہ ان کی خصوصیات کا تعارف کراتا ہے مگر تقویٰ کی شرط پر ارشاد ہوتا ہے یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ؕ

"اے سارے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت کے جوڑے سے پیدا کیا اور تمہیں خاندانی گروہوں اور قبیلوں میں بانٹ دیا تاکہ تم ایک دوسرے کا تعارف کرسکو۔ مگر تم سب میں مکرم ترین وہی ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو"

اس آیت میں انسانی شعوب و قبائل کا ایسے فطری انداز میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ جس سے طبع انسانی انکار نہیں کرسکتی، کہ وہ اولادِ آدم ہے۔ اور شعوب و قبائل کی شکل میں اکنافِ عالم میں بٹی ہوئی ہیں۔ مختلف حالات و مختلف زبانوں سے دوچار ہیں۔ کچھ بھی ہو ان سب کی اصل ایک ہے۔ قدرتی طور پر انسان ایک دوسرے کو پہچاننے کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔ اور ایک دوسرے پر بڑائی جتانے کے متمنی بھی ہیں۔ مگر جب یہ انسان اِستکبار مال وجاہ کے ساتھ اظہارِ تفاخر کرتے ہیں۔ تو اس اظہار سے بجائے شرافت کے تکبر کا اظہار ہوتا ہے۔ یہی تکبر جذبات کشی کا باعث بنتا ہے۔ جس سے اخلاقی قدریں پامال ہوتی ہیں۔ قرآنِ مجید نے انسانی شعوب و قبائل کیلئے اولادِ آدم ہونا شرط قرار دیا ہے۔ مگر شرافت کے لئے تقویٰ کو معیار قرار دیا ہے۔

اس مقام پر اِنَّ اَکْبَرَکُمْ نہیں فرمایا بلکہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ فرما کر تکرم و تکبر میں فرق کردیا ہے۔ چونکہ لفظِ اکبر میں اپنے جیسے انسانوں پر بڑائی کا اظہار

جذبات کشی کی علامت ہے۔ جو مساواتِ روحانیہ کیلئے سخت نقصان دہ ہے اس لئے تکبرِ انسانی کو شرافت کا معیار قرار نہیں دیا۔ بلکہ تکریمِ انسانیت کو انسانی عظمت کا نشان بنایا اور اس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی۔

تقویٰ کے معنے اصطلاحِ قرآن میں اللہ حاکمِ مطلق سے خوف رکھنا اور اس کے احکام کی تعمیل کرنے کے ہیں۔ اور مجوزہ نیکیوں کو حاصل کرنے اور برائیوں سے بچنے کے ہیں۔

نیکی سچے دل سے حاصل کی جاتی ہے۔ اور سچے دل سے برائیوں سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ قرآنِ مجید سب سے پہلے اپنے جسم و جان پر مساوات کا حکم دیتا ہے، پھر اپنے والدین، ذوالقربیٰ، یتامیٰ، مساکین، مسافر اور سائلین کے ساتھ مساوات کی تعلیم دیتا ہے۔ اسی ترتیب سے اہلِ اسلام، غیر اہلِ اسلام سے مساوات روا رکھنے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ اقوامِ عالم، مذاہبِ عالم سب ہی سے حُسنِ مروت کا حکم دیتا ہے۔ وہ اسلامی احکام و اعمال کو زبردستی کسی پر مسلط کرنے کا روادار نہیں۔ بلکہ حُسنِ مساوات کے ساتھ تبلیغ کی تجویز پیش کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ارشاد ہے:۔

لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ

کہ کوئی قوم کسی دوسری قوم کو حقیر سمجھ کر استہزاء نہ کرے۔ کیا تعجب ہے کہ اس میں اس سے بہتر اخلاق والے موجود ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ جس معاملے میں وہ ان کا استہزاء کرتی ہے، وہ اس معاملے میں یا دوسرے معاملات میں اس سے بہتر ہو۔ یہ اخلاقی حُسنِ مروت ہے جس کی قرآنِ کریم تلقین کرتا ہے وہ یہ بھی ارشاد کرتا ہے کہ تم کسی کے جھوٹے معبودوں کو بُرا بھلا نہ کہو کہ اس کے جواب میں وہ تمہارے سچے معبود کو بُرا بھلا نہ کہیں۔ یہاں تک کہ اسلامی تعلیمات میں یہ بھی

فرمایا گیا ہے کہ تم نیکی کرو، اور اس کو بھول جاؤ۔ اس واسطے کہ کی ہوئی نیکیوں کو یاد کرنے سے فخر پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی فخر بعد میں تکبّر کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ جس سے مساوات کو نقصان پہنچتا ہے۔

سلامی تعلیمات میں قومی دولت کو سخت احتیاط سے خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کہ کہیں عوامی دولت غیر منصفانہ طور پر خرچ ہو کر عامۃ النّاس کے نقصان کا باعث نہ بنے۔

قرآنی تعلیمات نے محمود و ایاز کے امتیاز کو ختم کر دیا۔ قرآن مجید اپنے پیروکاروں کو ایسی توجہ۔ ایسی سُوجھ بُوجھ اور ایسی غیرت و حمیّت دیتا ہے کہ شاہ چٹائی پر بیٹھ کر اظہارِ عبودیّت کرے اور گدا اپنی دریدگی میں خُدا پر اتنا ناز کرے کہ سلطانِ زمانہ اس کے سامنے حیران ہو جائے۔ یہ تصورِ قرآنی جو مساوات دیتا ہے۔ اس کا کروڑواں حصّہ بھی اشتراکیّت نہیں دے سکتی۔ اشتراکیّت کی داغ بیل تقسیم مال پر رکھی گئی ہے۔ جس میں دل کا کوئی تعلق نہیں اور اس میں خوفِ خُدا کا کوئی شائبہ نہیں۔

سلام اس کے مقابلے میں اکتسابِ مال کے ساتھ صحیح مصرف کی تعلیم دیتا ہے جس میں خوفِ خدا کا بڑا دخل ہے، کہ چُھپ کر اور اعلانیہ طور پر کچھ کرے گا۔ اس سے اس کا خُدا باخبر ہوگا۔ عورت، زمین اور مال یہ تین چیزیں ہیں۔ کہ ان کی وراثت سے متروک ہونیکے دعوؤں کے بعد بھی کوئی قوم ترکِ وراثت پر قادر نہیں ہوسکتی۔ پسندیدگیٔ حُسن کی دوڑ آج بھی جاری ہے۔ جس کا تعلق قلب ونظر سے ہے۔ جس پر کوئی احاطہ نہیں کرسکتا۔

بعض قوموں میں عورت کو مشترک سمجھنے کے بعد بھی ان کی پسندیدگی کی دوڑ جاری ہے۔ جس پر ناراضگیاں اور فساد جاری ہیں اور خون خرابہ جاری ہے۔

زمین مشترک ہونیکی صورت میں بھی پسند کی جاتی ہے۔ اور اس کو اپنانے کی داخلی دوڑ جاری ہے۔ اشتراکیت پسند لوگ بھی مکانیت اور سکونت کیلئے اچھی جگہ اور باغات حاصل کرنے کی تگ ودو کرتے ہیں۔ مال مشترک ہونیکی صورت میں بھی مکتب کو اکتساب مال کے اظہار کیلئے مجبور کر رہا ہے۔ ایسے لوگ زبردست ضابطوں کے اندر بول نہیں سکتے۔ لیکن ان کے دل ان بندھنوں میں مقید ہیں۔

قرآن مجید ایسے لوگوں کی جو نیک بیوی، نیک اولاد، نیک خاندان تیار کریں، حوصلہ افزائی کرتا ہے مگر سب کو اپنے اپنے مقام پر حسن مساوات کی تعلیم دیتا ہے تاکہ وہ اپنے لئے ہر خوشی پاسکیں اور مساوات کے ساتھ عدل وانصاف کو بھی برقرار رکھ سکیں باقی دنیا نے دولت پر ٹیکس عائد کئے۔ جس سے جبر کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر قرآن نے دولت پر زکوٰۃ عائد کی ہے۔ جس کا تعلق ایمان باللہ سے ہے۔ کہ زکوٰۃ دینے والا یہ سمجھتے ہوئے کہ میں اللہ کا ہوں، میری دولت اللہ کی ہے، اور مرنے کے بعد میرے ساتھ نہیں جائے گی۔ میں اللہ کے حکم کی تعمیل میں زکوٰۃ دے رہا ہوں۔

اس سے ایک طرف اخلاق باطن کو تقویت ملتی ہے۔ اور دوسری طرف لوگوں کو اس کا منافع پہنچتا ہے۔ ایک ہزار دولت مند لکھ پتیوں کی طرف زکوٰۃ حکم الٰہی کے مطابق دو کروڑ ۵۰ لاکھ روپے بنتی ہے۔ ایک آزاد اور خود مختار ریاست میں جہاں لکھو کھا صاحب نصاب لکھ پتی، کروڑ پتی اور ارب پتی ہوں۔ اس تناسب سے اگر ان کی سالانہ زکوٰۃ حاکمانہ طور پر وصول کی جائے اور سالانہ فصلوں کا عشر لیا جائے تو تعداد اربوں روپے بن جاتی ہے۔

اگر خوف الٰہی کی بناء پر سارے لوگ قرآن مجید کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے صرف زکوٰۃ اور عشر ادا کریں اور اسلامی حکومتیں خوف الٰہی کی بنیاد پر

زکوٰۃ وصول کریں۔ اور خزانہ میں جمع کریں اور قرآنِ مجید کی تقسیمِ مال کے مطابق عوام کے مصرف میں لائیں تو یقیناً دس سال کی مدت تک اسلامی ریاست میں کوئی گداگر۔ کوئی مفلوک الحال اور کوئی محتاج نہیں رہ سکتا جو دوسرے کے سامنے دستِ سوال دراز کرے۔

جب ساری قوم غیر محتاج ہو جائے تو ایسی حالت میں اسلامی ریاست کی زکوٰۃ خزانۂ ریاست سے نکل کر دوسری ریاستوں تک خیرات کو پھیلا سکتی ہے اور تبھی زکوٰۃ سفرائے قوم۔ مُبلّغینِ قوم۔ اقوامِ عالم کی فلاح و بہبود کیلئے خرچ کر کے اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کر سکتے ہیں اور یہ زکوٰۃ اسلامی ریاست کو ایسا مشن دیتی ہے کہ جس سے عالمِ انسانیت تک مسلمان ریاست کی خدمت پہنچ سکتی ہے۔ اسلام کی ساری ریاستیں اگر قرآنِ مجید کے اس نظامِ زکوٰۃ کو صحیح طور پر اپنا لیں۔ تو پوری انسانیت قانونِ خداوندی کے سامنے دیوانہ وار ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو سکتی ہے۔

اسی واسطے قرآنِ مجید اس آئینِ فطرت کے مطابق حکم دیتا ہے کہ :۔

وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ

اس فرمانِ قرآنی کی ہمہ گیری قابلِ غور ہے۔ خالقِ کائنات، ناظمِ کائنات، متحرک ہست و بود اور ربِّ کائنات کی عبادت کرو۔ کوئی طبیعتِ انسانیہ اس سے مفر نہیں پا سکتی۔ اس واسطے کہ انسان معبود نہیں ہو سکتا۔ اس نظریۂ عبادت کے بعد زکوٰۃ ادا کرو۔ یعنی ریاست میں اندرونی طور پر مالا مال ہو کر قطعی آسودہ حال ہو جاؤ تاکہ داخلی احتیاج مطلقاً ختم ہو جائے، اور اس مال کو لیکر گلی کوچوں میں اہلِ حق تک پہنچاؤ اور اپنے امیر کی معیت میں نماز پڑھتے ہوئے اللہ کی کبریائی کا مظاہرہ کرو کیا عجب سودا ہے کہ سر خدا کے سامنے جھک رہے ہیں، اور مالِ انسانیت

میں تقسیم ہو رہا ہے۔ یتیموں۔ بیواؤں اور بے کسوں کی فریادیں سُنی جا رہی ہیں۔ تعلیم ریاست میں عام ہو رہی ہے۔ صنعت و حرفت عروج پر پہنچ رہی ہیں۔ ریاست کے باشندے زراعت میں خودکفیل ہو رہے ہیں۔ دفاعِ ریاست کے لئے سامانِ حرب وضرب سے ریاست کے اندر اور باہر لیس ہو رہے ہیں۔ سفر و حضر میں اپنے امیروں کے ساتھ منظم نمازیں ادا کر رہے ہیں۔ لوگوں سے نہایت خوش اخلاقی اور تبسّم سے پیش آتے ہیں۔ ان کے حُسنِ اخلاق پر دُنیا فریفتہ ہو کر اُن کی طرف دوڑ رہی ہے۔ یہ وہ حُسنِ اخلاق ہے۔ جو دِلوں پر حسین قیامت بپا کر رہا ہے۔ کوئی دل مسخر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اس زکوٰۃ کے علاوہ ارشاد ہوتا ہے:۔

یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ ط

"اے رسولِ پاک صلی اللہ علیک وآلِک وسلّم! لوگ آپؐ سے انفاق کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپؐ فرما دیجئے، کہ زکوٰۃ کے علاوہ بچے ہوئے مال کو بھی اللہ کی راہ میں حسبِ ضرورت خرچ کرو۔"

اس آیت کے مطابق کسی وقت بھی انسان کو انفاقِ مال سے بے خبر رہنے کی اجازت نہیں ملتی۔ پھر اخلاقِ باطن کی تربیّت کے لئے صدقات کی ادائیگی پر جس صداقت کی تعلیم دی گئی ہے، اس کی مثال اقوامِ عالم اور ادیانِ عالم پیش نہیں کر سکتے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى

"یعنی اے ایمان والو! اپنے صدقات۔ یعنی زکوٰۃ اور نفلیہ خیرات۔ ریاکاری اور ایذارسانی کے ساتھ برباد نہ کرو۔"

ریا اور ایذا کے ساتھ صدقات کا ذکر فرما کر یہ ثابت کر دیا۔ کہ صدقہ ریا

اور ایذاء کی صورت میں بظاہر خیرات تو ہوتا ہے۔ لیکن عنداللہ وہ نامقبول ہوجاتا ہے۔ ریا اس دکھاوے کا نام ہے۔ جو صرف لوگوں کی خوشنودی پر محمول ہو اور اس میں خوفِ خُدا کا قطعاً دخل نہ ہو اور صدقے کی ایذا یہ ہے، کہ اہلِ حق کے علاوہ اُن لوگوں کو دیا جائے یا کھلایا جائے جو اس کے مستحق نہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ صدقہ خیرات چاہے فرض ہو یا نفل۔ اس کے حقدار صرف غریب، مفلوک الحال اور محتاج لوگ ہی ہوتے ہیں۔ جو لوگ غیر محتاج ہوں، وہ صدقہ لینے کے عندالقرآن مجاز نہیں اگر غیر محتاج لوگوں کو صدقہ دیا جائے، تو یہ غریبوں کی حق تلفی ہے، جس سے غریبوں کو ایذا پہنچتی ہے۔ اس واسطے غیر محتاج لوگوں کو صدقہ دینا ایذا میں شامل کیا گیا۔

قرآنِ مجید کی تعلیمات، مساوات کو ان واضح راہوں پر چلانا چاہتی ہیں، جہاں کوئی اذیّت، اخلاقی، روحانی، جسمانی، ظاہری اور باطنی طور پر کسی بھی طرح محتاج کا حق غصب نہ کر سکے۔ جو قوم یا ملک یا ممالک اس نظریے پر عمل پیرا ہوں وہاں کیونکر احتیاج باقی رہ سکتی ہے۔

قرآن مجید اسلامی ریاستوں کو اسی طرح عمل پیرا ہو کر بنی نوع انسان کو اسلام کی طرف دعوت دیتا ہے تاکہ ساری انسانیت ایک ہی آئین کے تابع ہو کر روحانی، جسمانی آسودگی پا کر غیر محتاج ہو کر اللہ کی بندگی کریں اور شر و فساد کو دُنیا سے دُور کر کے امنِ عالم کا عَلَم بلند کریں۔

قرآنِ مجید اور فلسفۂ جہاد

قرآنِ کریم کا نظریۂ جہاد وجودِ کافر کیلئے مہلک نہیں، بلکہ کافر کے افعالِ کافرانہ کیلئے مہلک ہے

قرآنِ مجید کا نظریۂ حیات پوری انسانیت کے ساتھ حسنِ سلوک کا روادار ہے۔ اور پورے کا پورا قرآن پوری انسانیت کا احترام کرتا ہے

قرآنِ مجید نے جہاں کافر۔ کفار۔ کاذب۔ کذّاب وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں یہ گالیاں نہیں ہیں، بلکہ برائیوں کیلئے اصطلاحات ہیں۔ تاکہ برائیوں کو انکے ناموں کے ساتھ یاد کیا جائے مثلاً کافر کے معنی منکر کے ہیں۔ کاذب کے معنی جھوٹ بولنے والے کے، اور کذاب بہت زیادہ جھوٹ بولنے والا، قرآنِ مجید جہاں خفی وجلی ہدایات کا ضامن ہے، وہاں وہ الٓمّٓ تا وَالنّاس کے الفاظ کی ایک آخری ڈکشنری ہے۔

"جہاد"۔ جہد سے مشتق ہے جس کے معنی کوشش کرنے کے ہیں۔
قرآنِ مجید کی نظر میں ہر وہ کام جو اللہ کیلئے کیا جائے اور اللہ کی راہ میں رُوبہ عمل آئے۔ اس کو جہاد فی سبیل اللہ کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآنِ مجید ایسے مصالحانہ انداز سے تجویزِ جہاد پیش کرتا ہے۔ جو عدلِ فطری کے عین مطابق ہو۔ قرآنِ مجید ہر اس جارحیت کی ممانعت کرتا ہے، جو بلا وجہ انگیخت پر مبنی ہو۔ صداقتِ ذاتیہ سے کذب واقع نہیں ہو سکتا کیونکہ صداقت کذب و اختراعات کا ذبانہ کی ضد ہے
قانونِ قدرت نے ہر چیز کو خیرِ محض کی صُورت میں پیدا فرمایا اس خیرِ محض کی سلامتی کے لئے اس کو ذاتی طور پر ایسی قوتیں تفویض فرما دیں جو اس کی بقا و عافیت کے لئے دفاع کا کام دیتی ہیں۔ یہی دفاع اس کے متضاد مہلکات سے نبرد آزما ہو کر جہاد بن جاتا ہے۔ پتھر کی سختی اس کیلئے دفاعی حیثیت ہے۔ پہاڑوں کی بلندیاں اور سختیاں ان کیلئے دفاعی فرائض سرانجام دیتی ہیں۔ آسمان کی رفعتیں اپنی بقا کیلئے دفاعی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ایک درخت کی شاخ اپنے اندر حوادث کا مقابلہ کرنے کیلئے ایک قدرتی لچک رکھتی ہے اور آندھیاں اور طوفان برداشت کرنے کیلئے اس میں وہ فطری لچک ایسے خم و پیچ پیدا کر دیتی ہے کہ وہ اپنے خم و پیچ سے بچاؤ کی صُورت اختیار کر لیتی ہے۔ آتش، آب، باد و خاک سب میں قدرت نے اپنے دفاع کیلئے مختلف صلاحیتیں تفویض کر رکھی ہیں۔ حرارت۔ برودت سے اور برودت حرارت سے اور ہوائیں رکاوٹ سے اور رکاوٹیں ہواؤں سے اور خاک قوتِ ثقل سے اور ثقل لطافت سے ہمیشہ برسرِ پیکار ہو کر اپنا اپنا

دفاع کرتے ہیں۔

اشیائے عالم کا باہمی تضاد ایک طرف اپنی نوعیت کی حفاظت اور دوسری طرف اپنی بقائے حیثیت کیلئے اپنی ہیئتِ مجموعہ پر استقامت پاکر اشیائے عالم کی صف میں اپنی تاریخ مرتب کرتا ہے۔ اس کی بقا ہی اس کی تاریخ کی ضامن ہوتی ہے۔ اشیائے عالم میں سے جو چیز بھی اپنی دفاعی صلاحیتیں کھو بیٹھے، اسے ہلاکت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ قانونِ فطرت کے اسی اصول پر حق و باطل کی تخلیق ہوئی۔ حق کے معنی سچائی کے ہیں۔ اور باطل کے معنی جھوٹ کے ہیں درحقیقت جھوٹ اس مہلک داستان کا نام ہے جو اچھائیوں کیلئے زہرِ قاتل کی حیثیت رکھتی ہو اور سچائی اس چیز کا نام ہے جو انسانوں کے راستوں سے ان مہلکات کو دور کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو۔ جو انسانوں کی فطری صلاحیتوں کیلئے مہلک ہوں ہر سچائی ہر برائی کیلئے مدافعانہ صلاحیت رکھتی ہے۔

انسانی دنیا میں دو قسم کے دفاع ہر زمانہ میں موجود رہتے ہیں۔ ایک دفاعِ باطلانہ اور ایک دفاعِ حقانہ دفاع باطلانہ کی بنیادیں نفسانی غضب، نفسانی عصبیت اور نفسانی ضد پر مبنی ہوتی ہیں۔ جو جارحیت سے نہیں بچ سکتیں اور دفاعِ حقانہ کی بنیاد ایمان باللہ پر ہوتی ہے۔ جس کا آئین خدا کی مجوزہ صداقتوں پر مبنی ہوتا ہے۔ خدا اپنی مخلوقات پر کبھی ظلم نہیں کرتا اور نہ ہی ان سے ناروا سلوک کرنا اس کے ارادے میں آسکتا ہے۔ اس واسطے اہل حق کا دفاع آئینِ فطرت پر مبنی ہونے کی بنا پر کبھی جارح نہیں ہو سکتا۔ قرآنِ مجید جہاد کو بقائے صلح کیلئے پیش کرتا ہے اور اپنے مجاہد کو ہر میدان میں جدال سے بچنے کی تاکید کرتا ہے۔

اولادِ آدم نے ہمیشہ منفعتِ نفسانی کیلئے جدل و قتال کو جاری رکھا اور یہ ہوسِ نفسانی کی پرانی عادت چلی آئی ہے کہ وہ کسی دعوتِ حق کے بغیر محض آمرانہ

حیثیت کو حاصل کرنے کیلئے جدال و قتال پر انسانوں کو آمادہ کرتی رہی۔ یہاں تک کہ اگر آوازِ خداوندی عادل انبیاء کے ذریعے دعوتِ حق کو نہ جاری کرتی تو شاید انسان ہمیشہ کے لئے درندہ ہو جاتا۔ اور جدال و قتال کے ساتھ پھاڑنا۔ جبراً خون بہانا اور لوگوں کو گھر سے بے گھر کرنا اس کا دائمی مذہب ہو جاتا۔ مگر ایسے پیہم ظلم و عدوان کے زمانوں میں بار بار کلمۃ الحق کا بلند کرنا اور بار بار انسانیت کو حق کے ضابطوں کا پابند کرنا انسانیت کی اس ظالمانہ عادت کو حق کے گرز سے ضرب لگانا اس کی عادت کو حق کی طرف مائل کرنیکا ایک ذریعہ بنتا رہا۔

اس مسلسل عادتِ صالحانہ کی سب سے پہلی آواز۔ آوازِ حق تھی۔ جو خدا کے ساتھ متعلق ہو کر دنیا میں آدم کی صورت میں ثبوتِ نبوت کے ساتھ نمودار ہوئی اور آدم نے اس آوازِ حق کو اپنی اولاد کے کانوں میں ڈالا۔ آپ کی اولاد میں ہابیل و قابیل کا واقعہ قرآنِ مجید بیان کرتا ہے کہ یہ پہلا فسادِ حق و باطل کی جنگ کی صورت میں نمودار ہوا ایک بھائی نے دوسرے بھائی کو اپنی قوتِ بدنیہ کے ساتھ مارنے کی دھمکی دیکر اسے مرعوب کرنیکی کوشش کی کیونکہ اس دھمکی سے اس کو منفعتِ نفس مقصود تھی۔

اس وقت اس فساد کا ذریعہ عورت بنی۔ نفس اپنی بنائے خواہش کے مطابق انتخاب نکاح کیلئے یا انتخاب زوجیت کیلئے مشتعل ہوا جس بھائی پر نفسانیت غالب تھی اس نے جارحیت کے ساتھ حصولِ مقصد کے لئے اپنی مدافعانہ حیثیت قتلا کو سامنے لانیکی کوشش کی اور جس پر حق غالب تھا اس نے اس کو قاتلانہ جارحیت کے مضرات بیان کر کے اللہ کے غضب سے ڈرا کر ارتکابِ جرم سے بچانے کی پیہم کوشش کی اور اللہ کے نام سے اس کو صدائے بازگشت دیتا رہا۔ یہاں تک بھی اس نے اس کو ناحق قتل کرنے سے بچنے کی ترغیب دی۔ کہ میں تجھ کو نہیں

مار دوں گا۔ اور میں اللہ پر بھروسہ کرتا ہوں۔ اُس کو حق پر یقین تھا۔ کہ حق حیات و موت دونوں میں یکساں طور پر منفعت بخش ہے اور اس کی جزائے خیر ملتی ہے اور ظلم حیات و موت دونوں میں نگاہِ حق کا معتوب ہے اور انجام کار وہ عذابِ الٰہی سے نہیں بچ سکتا۔

چنانچہ نفس کی باطل بنیادوں پر دفاع کرنیوالے بھائی نے ظلم و عدوان کے ساتھ اپنے بیگناہ بھائی کو قتل کر کے جارحیت کی بنائے اوّل ڈال دی اور اولادِ آدم پر جارحیت کی راہ کھول دی دوسرے نے حق پر شہید ہو کر اپنے خونِ پاک سے حق کی آبیاری کی اور حق کی راہ کھول دی اور اپنے مقدس خون سے لوحِ آدم پر لکھ دیا کہ ہمیشہ باطل کے سامنے اہلِ حق کو قربانیاں دینی پڑیں گی۔

ایثار و قربانی کی بنیاد ہی صلۂ رحمی کے ساتھ ہوتی ہے۔ حق نفع رسانی کی راہوں پر ڈالنے کیلئے آتا ہے اور ہر اس تدبیر کو اختیار کرتا ہے۔ جو راہِ حق پر گامزن ہونے کیلئے ضروری ہو سکتی ہے۔ اس ضرورت میں سب سے پہلا کردارِ حق رحم و کرم ہوتا ہے۔ رحم و کرم کی جبلّت عافیّت طلب ہوتی ہے مگر اس کے بعد رحم و کرم کے پاس ایک عادتِ رافت بھی ہوتی ہے جو ماں اور باپ کی شفقت کے مشابہ ہوتی ہے۔ جیسے ایک ماں کے سامنے اس کا محبوب بیٹا سانپ سے کھیل رہا ہو یا کسی مہلک چیز کے ساتھ کھیل رہا ہو تو ایسی حالت میں ماں کی رافت اس مہلک چیز سے بچانے کیلئے سختی کی صورت میں بچے کا دفاع نہیں کرتی بلکہ بچے پر آنیوالی مہلک حالت کا دفاع کرتے ہوئے بچے پر جھپٹ پڑتی ہے اگرچہ بظاہر اس پر غیظ و غضب کے آثار نمودار ہوتے ہیں مگر بباطن اس کی یہ ساری کیفیت مرہونِ شفقت ہوتی ہے اور وہ آگ سے۔ پانی سے اور حادثوں سے کھیل جاتی ہے۔ اس حالت میں معصوم بچہ روتا ہے کیونکہ

وہ مہلکات سے بے خبر ہے وہ اپنی نادانی کی بنا پر ایک ہلاکت انگیز واقعہ سے مانوس ہو کر طفلانہ دلچسپیوں کے ساتھ کھیلتا ہے۔ اس کی یہ مُوانست اس کی طفولیّت کا حصّہ ہوتی ہے اور یہی نادانی ماں کی رافت پر ناراض ہو کر رونا شروع کر دیتی ہے ماں کیلئے بچّے کا چند منٹ کا رونا ناگوار ہو سکتا ہے مگر بچّے کی ہلاکت سخت ناگوار ہوتی ہے یہ کردار حقیقی شفقت کا ایک حصّہ بن کر بچّے کے مصائب میں دفاع بنتا ہے اور یہ مادۂ رافت سنت اللہ ہے۔ سنتِ رسول اللہ اور سنتِ اولیاً اللہ ہے۔

اللہ کی عادتِ کریمانہ رؤف و رحیم ہے۔ اللہ کی یہ سُنّت ہر سچے شفیق کے دل میں موجود ہوتی ہے۔ اللہ کے بعد یہ عادت سب سے زیادہ انبیاء علیہم السّلام میں پائی جاتی ہے۔ کہ وہ ہر اُس بُرائی سے بچانے کیلئے سر بکف ہو جاتے ہیں۔ جو کسی طرح بھی نوعِ انسانی کیلئے مُہلک ہو۔ اس کے بعد اولیاء اللہ میں یہ عادت نسبتاً زیادہ پائی جاتی ہے۔ چونکہ وہ اللہ اور رسولؐ کے حکم کی تعمیل میں متخلق بہ اخلاقِ باللہ ہو سکتے ہیں۔ جملہ ماں باپ میں یہ عادتِ فطرت نے بہتات کے ساتھ ودیعت کر دی ہے۔ اور ہر خطرناک حالت میں ظہور پذیر ہو کر اپنے محبوبوں کیلئے دفاع کرتی ہے۔ تمام چرند، پرند اور مرغ و ماہی میں بصورت مادر و پدریہ شفقت کارفرما ہو کر جمال و جلال کی صُورت اختیار کرتی رہتی ہے۔ ہر شفیق کا جلال اپنے محبوب کیلئے دفاع ہوتا ہے۔ اور ہر جلال شفقتِ پدری و مادری اولاد کی تربیت کیلئے اپنے تمام عوامل ظاہریہ و باطنیہ کو شفقت و غضب کی صورت میں بروئے کار لانے کا عادی ہوتا ہے۔ یہی تربیت و شفقت اسلامی حکمرانوں میں جلوہ گر ہو کر داخلی و خارجی بُرائیوں کا دفاع کرتی ہے۔

یہی عادت پروردگارِ عالم کے حضور سے آغاز کرتی ہوئی قانون کی صُورت میں ضوابط سے گزرتی ہوئی انسانوں کو راہِ راست پر لاتی رہی ہے۔ اور یہی

عادت ہمیشہ انسانوں کیلئے یکساں مفید رہی۔ قرآنِ مجید کا نظریہ جہاد رافتِ خداوندی کو اس انداز سے پیش کرتا ہے۔ کہ جو نادان لوگ عزتِ شخصی، عزتِ مالی، عزتِ اجتماعی، عزتِ حکومت وسطوت کو بقائے حیات کا سامان سمجھ کر انصاف و عدل سے دُور ہو کر اپنی محبت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔ جس طرح ایک معصوم بچہ ماں باپ کی موجودگی میں آگ۔ سانپ۔ چاقو وغیرہ کو خوبصورت جان کر اس سے کھیل رہا ہو۔ بعینہ اہلِ دُنیا نفس کے موہوم حرص دہوا کا شکار ہو کر دنیا اور اُس کے جاہ ومال کو اپنا بنا کر ان سے کھیلتے ہیں۔ اور لاتعداد لوگوں کا حق غصب کرتے ہوئے ان اموال سے مانوس ہوتے ہیں۔ تو حق کی شفیق آنکھوں کے سامنے ان کی حالت سانپ سے کھیلنے والے بچے کی مانند ہو جاتی ہے۔

جب بچے کے ماں باپ جو اللہ کی مخلوق ہیں اپنی حالتِ غضبیہ کو شفقت کی بناؤں پر بروئے کار لاکر بچے کی ہلاکت کا دفاع کرتے ہیں۔ تو خدائے رحمان و رحیم جیسی شفیق ہستی انسانیت کو ظلم و عدوان جیسے مہلک عفریت سے بچانے کیلئے اپنے قانونِ قدرت کے ساتھ اپنی جلالت کو کیونکر اظہار میں نہ لائے اس کی جلالت کا اظہار کہیں رعد و برق کی صورت میں۔ کہیں ہولناک طوفانوں۔ آندھیوں۔ زلزلوں۔ قحط سالیوں۔ وباؤں کی صورت میں اور کہیں انسانی باہمی انقلابات کی صورت میں رُونما ہو کر ہلاکتوں سے بچنے کی تعلیم دیتا ہے تاکہ عقل انسانی مافوق الادراک حادثات کے ورُود سے خدا کی جلالت کا اندازہ کرتے ہوئے مہلکاتِ باطلہ سے بچ سکے اور مفہوم کر سکے کہ بُرائیوں سے بچانے کیلئے ہمیشہ جلالتِ شفیقانہ ہی صحیح دفاع ہو سکتی ہے۔

قرآنی نظریۂ جہاد کے خلاف جو دفاع بھی بروئے کار لائے جائیں اُنکی بنیاد اصلیہ شفقت پر نہیں ہوتی بلکہ اُن کی بنا ذاتی حرص و ہوا پر استوار ہو کر

سراسر جارحیت بن جاتی ہے۔ چور۔ ڈاکو۔ رہزن قاتل۔ فاسق و فاجر سب کے سب نفسانی حرص و ہوا پر ظلم و ستم کی راہیں اختیار کرتے ہیں اگر سیاست انسانیہ میں بھی ایسے جرائم کی عادت پیدا ہو جائے تو یہ انسانی سوسائٹی کی سب سے بڑی بدقسمتی ہوتی ہے۔

ایسی حالت میں انسان تہذیب اور شرافت کے جامہ میں اور امارت و غلبہ کی صورت میں شفقت سے محروم ہو کر۔ انسانیت پر ظلم بن کر اپنی آمریت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ایسے اکابرین کی عادت غاصبانہ پوری دنیا کیلئے ذریعۂ معاصی بن جاتی ہے جب بھی ایسا معاشرہ ذرا سکون پائے گا تو اس سے وہی معاصی سرزد ہونے شروع ہو جائیں گے جو ان کے آمرانہ اکابرین نے اپنے لئے وجۂ عروج بنائے ہوئے تھے عوام کے معصوم اذہان پر ایسی دلچسپ آمریت نقش کالحجر ہو جاتی ہے اور وہ بھی عزتِ نفسی کیلئے انہی آمرانہ عادتوں کو اپنانے کے درپے ہو جاتے ہیں اور وہی چور۔ ڈاکو۔ قاتل۔ ظالم بھیڑیئے۔ درندہ صفات لوگ ظلم کی راہوں پر تربیت پا کر عزت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے لامحالہ ناانصافی بار بار سامنے آتی ہے اور حق و صداقت کی راہیں پامال ہوتی ہیں۔

یہ طریقہ آگ اور زہرناک اژدہے سے کم نہیں ہوتا درحقیقت اللہ کی تعلیمات میں اس کا نظریۂ جہاد گناہ گار کیلئے جاہد نہیں بلکہ گناہ کے پامال کرنے کیلئے ایک جہاد ہے۔

قرآن مجید کا نظریۂ جہاد کافر کیلئے مہلک نہیں بلکہ کافر کے افعال کا فرانہ کیلئے مہلک ہے قرآن مجید کا نظریۂ حیات پوری انسانیت کے ساتھ حُسنِ سلوک کا ہے اور ہونے کا پورا قرآن انسانیت کا احترام کرتا ہے وہ بھائیوں بہنوں کے سامنے بیٹوں کو ماؤں کے سامنے اور بھائیوں کو بہنوں کے

سامنے اور بہنوں کو بھائیوں کے سامنے مجروح، مذبوح اور مقتول کی حیثیت دینے سے قطعاً گریزاں ہونے کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ جہادِ فی سبیل اللہ میں مجاہد سے انسانی برادری کی بہنوں، ماؤں، ضعیف لوگوں، بیمار اور مجبور لوگوں کی عافیت کا عہد لیتے ہوئے جہاد کی تلقین کرتا ہے اور ناحق قدم جہاد بڑھانے سے سخت منع کرتا ہے اور جہاد میں پہل کرنے سے شدت کے ساتھ منع کرتا ہے اور جہاد سے پہلے استقامتِ نفس پر سخت ضابطے کی تعلیم دیتا ہے اور نفسانی غیظ و غضب پر ضابطہ کرنے والے مجاہد کو جہادِ اکبر کا مجاہد قرار دیتا ہے اور تلوار کے جہاد کو جہادِ اصغر سے تعبیر کرتا ہے۔

قرآنِ مجید کے نظریۂ جہاد میں ذاتی غیظ و غضب پر سبقت لے جانے کا نام جہادِ اکبر ہے جو مجاہد خوفِ الٰہی سے اپنے نفسیات پر قابو نہیں پا سکتا اس کو تلوار اور نوکِ خنجر سے زندگانیوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت نہیں مل سکتی اور وہ جہادِ اصغر کے میدان میں نکلنے کا مجاز نہیں ہو سکتا کیوں کہ خنجر اور نوکِ خنجر یا اسلحۂ حرب و ضرب سب کے سب کسی کی جانِ عزیز کا خون بہا سکتے ہیں اور جس کا خون بہایا جاتا ہے وہ کسی کی امیدوں کا سہارا ہوتا ہے۔ اسلام کسی کی امیدوں کو پامال کرنے کے لئے نہیں آیا بلکہ وہ پروردگارِ عالم کی طرف سے عالمِ مجاز میں انسانی امیدوں کی آبیاری کرنے کیلئے آیا ہے۔

وہ چمنِ انسانی کا باغبان بن کر آیا ہے۔ باغبان قاتلِ چمن نہیں ہو سکتا البتہ باغبان کی ایک حالت یہ ہوتی ہے کہ جب باغ کے اشجار بیمار ہو جائیں یا وہ اتنے بے ہنگم طور پر پھیل جائیں کہ ان کی ذاتی نشو و نما دوسرے اشجار کے پھلنے پھولنے میں رکاوٹ کا باعث ہو جائے تو وہ شاخ تراشی کرتا ہے یہ شاخ تراشی بظاہر سخت معلوم ہوتی ہے مگر اصولی اور معنوی طور پر اس میں دانشِ باغبان اور اسی شفقت

اصلیہ کی بنا پر شاخ تراشی کرتی ہے تاکہ اشجار صحیح نہج پر آ کر پھلیں پھولیں اور منفعت عامہ کا باعث بنیں۔ قدرت بھی بعض دفعہ انسانی بے ہنگم پھیلاؤ کو روکنے کیلئے گاہے گاہے انسانیت کی شاخ تراشی کرتی ہے۔

یہ شاخ تراشی بظاہر ہولناک منظر ہوتا ہے مگر اصولی طور پر انسانیت کو صحت مندانہ طریقے پر بار آور ہونیکا قدرتی طور پر موقع دیا جاتا ہے بعض حادثات غیر انقلابی صورت میں ارضی و سماوی حادثات بن کر رونما ہوتے ہیں اور یہ حادثات عین اس وقت ظہور پذیر ہوتے ہیں جب انسان کی رحم و کرم۔ عدل و انصاف۔ خدمتِ انسانیت اور اظہارِ صداقت کی صلاحیتیں مفقود ہو جائیں اور وہ محض جنگل کے ان درختوں کی طرح ہو جاتے جو ذاتی منفعت کیلئے ارض و سماء سے فائدہ اٹھا رہے ہوں اور ان کو کاٹ دیا جائے تاکہ نئے اشجار پیدا ہو کر نئی زندگانیوں کے ساتھ انسانیت کیلئے منفعت بخش ثابت ہوں۔

بالکل اسی طرح جب انسان صرف نفس کے ہاتھوں سعادتوں سے محروم ہو جاتا ہے اور اس سے نیکیوں کا پھل پیدا ہونا بند ہو جاتا ہے وہ سراسر برائیوں کا پیکر بن جاتا ہے اس کی برائیاں شرقین و غربین میں پھیل جاتی ہیں اور ساری انسانیت ان برائیوں کی لپیٹ میں آ جاتی ہے تو جملہ آفات اس کو سمجھانے کیلئے براہینِ ربانی کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں:۔

جہاندار داند جہاں داشتن
کسے را بر یدن کسے کاشتن

قرآنِ مجید کی سلامی تعلیمات اپنے مجاہدین کو اللہ کے نام سے جو رؤف الرحیم ہے کوششِ اولی کرنیکی تلقین کرتی ہیں تاکہ وہ راہِ جہاد میں کسی وقت کسی لمحہ ناجائز خواہشاتِ نفس کا شکار نہ ہونے پائیں چنانچہ ہر مجاہد اَعُوْذُ بِاللّٰہِ

مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ط بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کا آغاز کرتا ہے۔

"یعنی میں اللہ کے ساتھ اور اس کی معیت میں نفس و شیطان کی ہر برائی سے پناہ مانگتا ہوا اور اللہ ہی کے نام سے ہر کوشش کا آغاز کرتا ہوں۔"

اس کے بعد اس کو طہارتِ بدنی حاصل کرنیکا حکم ملتا ہے۔ طہارت ظاہری اور طہارتِ بدنی کے ساتھ اسے آوازِ حق بلند کرنیکا حکم ملتا ہے۔ چونکہ ہر ناپاکی برائی میں داخل ہے اس لئے اسلامی تعلیمات اس کو غلاظتوں کے ساتھ جہاد کرنیکا حکم دیتی ہیں کہ وہ سب سے پہلے اپنی ذاتی برائیوں کا قلع قمع کرے پھر دوسرے کی برائیوں کو دور کرنیکی کوشش کرے قرآنی تعلیمات کا منشأ یہ ہے کہ جو شخص اپنی ذاتی برائیوں کے ساتھ جہاد نہیں کرسکتا وہ دوسرے کی برائیوں کو دور کرنے کا حق بھی نہیں رکھتا۔

قرآنِ مجید کی یہ فطری تعلیم حق و صداقت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے وہی شخص دوسرے کی برائیوں کو دور کرنے کا حق رکھتا ہے جو اپنی برائیوں کے ساتھ جنگ کرسکے جن کی اپنی ذات۔ اپنا گھرانہ۔ اور اپنا ماحول برائیوں سے پٹا پڑا ہو وہ دوسرے کی برائیوں کو کیونکر دور کرسکتا ہے قرآنِ مجید کی تعلیمات میں جہاد ایک طرزِ تبلیغ ہے۔ قرآنِ مجید نے اس کی بہت سی صورتیں بیان فرمائی ہیں جنہیں جہاد بالنفس۔ جہاد بالمال۔ جہاد بالاولاد۔ جہاد بالعائلہ وغیرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:-

(۲) اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِکَ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ط

(پ ۱۰، آیت ۷۲ الانفال)

"یعنی جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور جہاد کیا اپنے مال اور جانوں کے ساتھ راہِ خدا میں اور وہ ایماندار جنہوں نے مہاجرین کی تائید کی ایسے ایماندار ایمانداروں کے رفیق ہیں"۔ اس آیت میں جہاد ترکِ وطن کے ساتھ اور جہادِ بالمال۔ جہاد بالنفس کی صورت میں بیان کیا گیا ترک وطن۔ جہادِ بالمال۔ جہادِ بالنفس۔ جہاد بالاعانت سب کے سب نفسیات کے خلاف ہیں۔

دوسری جگہ اللہ کی راہ میں ترکِ وطن کرنیوالے مال و جان سے جہاد کرنیوالے مومنوں کو اللہ کے نزدیک بہت بڑے درجے والا قرار دیا گیا تیسری جگہ ایسے مجاہدین کو اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ فرمایا یعنی یہی لوگ فائز المرام ہیں۔ چوتھے مقام پر ایسے مجاہدین کو یُبَشِّرُھُمْ رَبُّھُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ

"یعنی ان کو ان کے پروردگار کی طرف سے رحمت اور رضامندی کی خوشخبری دی گئی ہے" پانچویں مقام پر ایسے مجاہدین کیلئے فرمایا۔ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا یہی لوگ سچے ایمان والے ہیں اور فرمایا۔ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ط

ایسے ہی لوگوں کیلئے مغفرت اور رزق پاک کا وعدہ فرمایا گیا ہے ان کے علاوہ اس قسم کی قرآنِ مجید میں بہت سی آیات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جہاد اللہ کی راہ میں ہر اس نیکی کا حاصل کرنا ہے جو اپنے لئے اور دوسروں کیلئے نجات کا باعث ہو قرآنِ مجید میں جس مقام پر جہاد کو جنگ سے تعبیر کیا گیا ہے وہاں منکرینِ حق کو اپنے غلبۂ اسلام کے ساتھ اللہ اور اس کی صداقتوں کے سامنے سجدہ ریز کرنا مراد ہے آیاتِ جہاد میں جو جنگ کیلئے آئی ہیں قطعاً نفسانی مفاد کے لئے نہیں۔

اگر ایسی جنگ کو نفسانی مفاد پر مرتب کیا جائے تو عند القرآن ایسا جنگ مسلمانوں پر حرام ہے ایسی نفسیاتی لڑائی جس میں احیائے حق نہ ہو اسلام میں سرے سے اسکا

وجود ہی نہیں ملتا اس طرح مارے جانے والے شہید نہیں بلکہ مقتولِ محض ہونگے اس طرح لوگوں کو مارنے والے ظالم۔ جارح۔ غاصب۔ ناحق خون بہانے والے گردانے جاتے ہیں۔

اسلام خونِ انسانیت کا حقیقی امین ہے جو کسی مسلم یا غیر مسلم کے ناحق خون بہنے پر اپنی عدالت میں مقدمہ کرتا ہے اور اپنوں اور پرایوں سے اس کا بدلہ لیتا ہے خون بہا کا دستور اسلام نے پیش کیا۔ فدیہ۔ جزیہ۔ غیر مسلم کو ریاست میں امن عامہ سے رکھنا۔ قیدیوں سے بیگار نہ لینا۔ بلا وجہ کسی کو نہ مارنا۔ پہل نہ کرنا وغیرہ اسلامی جہاد کے صلح جُو ہونیکی دلیلِ عظیم ہے۔

قرآن کے اسلامی جہاد کا حتمی اقدام رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور انکے صحابہؓ نے کیا۔ تاریخ عیسوی سے اس دور تک جس میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآنِ مجید کی معیت میں معبوث ہوئے اُس وقت جہالتِ انسانیہ جس بربریت کے خوفناک حالات سے دوچار تھی وہ من وعن تاریخ اسلام اور تاریخ عرب میں موجود ہے۔ ناانصافی۔ بہیمیت۔ بے حیائی۔ جذبات کشی اور خون ریزی کی وہ عشوہ طرازیاں تھیں جن کو چشمِ فلک بھی دیکھتے ہوئے شرماتی تھی گویا اولادِ آدم میں ماضی کی تمام بُرائیاں سمٹ کر ریگ زارِ عرب کے سینے پر جمع ہوگئی تھیں جن کا مرکزی مقام مکہ تھا۔

جہاں لاتعداد بُت انسانی جبینوں کو جُھکانے کیلئے آویزاں کیئے گئے تھے ماضی کی وہ تعلیمات جو ان کے ورثہ میں آئی تھی اور انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے ان کو ذہن نشین کرایا تھا وہ سب عیش وطرب کے ہاتھوں سرِ بازار پامال کر دی گئیں عفتِ انسانیت سرِ بازار لٹ رہی تھی اور رحم وکرم کا نام ونشان تک انکے چہروں پر نظر نہیں آسکتا تھا۔ ظلم وعدوان کی ایسی حکومت تھی کہ کسی شریف کو کلمۂ شرافت

اذاکرنیکی جسارت نہیں ہوسکتی تھی۔

پھر ظلم بالائے ظلم یہ تھا کہ اپنے ننگ انسانیت کردار پر ان کا اترانا اور غرورِ نفس کا شکار ہونا خدا اور اس کے رسول کا استہزاء کرنا اور نیکیوں کو سخت کرخت نگاہوں سے دیکھنا وغیرہ ایسے ایسے مظاہرات فطرت ان کو اتنے ناگوار گزرے کہ ظلم و عدوان کی ان طویل راتوں کو ختم کرانے کیلئے ایک آفتاب عالمتاب کے طلوع کرنیکی صورت پیدا ہو گئی۔

خداوندِ کریم کی یہ قدیم عادت ہے کہ دنیا سے انسانی تاریکیوں کو دور کرنے کیلئے ہدایت کے آفتاب طلوع کرتا رہا اس عادت کریمہ سے اس نے آخری بگڑی ہوئی صورت کو درست کرنے کیلئے اپنے آخری نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا اور ان کے ہاتھ میں کتابِ مبین دی تاکہ وہ اپنی شفقتِ عظیم سے اپنے مرسلانہ جلال و جمال کے ساتھ جلالِ خداوندی کا اسی کتاب کی زبان سے ترجمہ کریں اور اپنی آخری رافت کے ساتھ ان کو شفیق ماں کی طرح شفیقانہ تیوروں کے ساتھ اور شفیقانہ تبسم کے ساتھ غلطیوں کا احساس دلوا کر نیکیوں کی طرف بلائیں چنانچہ ارشادِ باری ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ قُمْ فَاَنْذِرْ ۙ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ ۙ
وَ ثِیَابَكَ فَطَهِّرْ ۙ وَ الرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۙ

"یعنی اے کملی پوش! سردرِ کائنات! اٹھ اور لوگوں کو ڈرا اور پاک و صاف اور دلنشین لباس پہن اور ہر قسم کی غلاظتوں سے الگ ہو جا"

ان آیات میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب کے بدحال لوگوں کو راہِ راست پر لانے کیلئے ڈرانے کا وہی طریقہ بتایا جو خدا اپنے بندوں سے اختیار کرتا ہے اور شفیق مائیں یا شفیق باپ اپنے بچوں سے اختیار کرتے ہیں۔ ترہیب کا یہ مشفقانہ سلسلہ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ سے ہوتا ہے کہ تو ان کو سب سے بڑے خدا کے نام سے

ڈرا۔ یعنی خدا کی بڑائی بیان کر پھر وَثِیَابَكَ فَطَهِّرْ خوش نما پوشاک کا اس تبلیغ کے ساتھ ملحق ہونا اس بات کی علامت ہے کہ وہ لوگ نفس کے دیوانے اور لباس سے بھی بے خبر رہ کر برہنہ ہو چکے تھے یا بصورتِ دیگر طہارتِ ظاہریہ سے محروم ہو چکے تھے۔

جہاں ان کی باطنی تہذیب برباد ہو چکی تھی وہاں ان کی ظاہری تہذیب بھی بربادیوں کا سامنا کر رہی تھی اور چوتھے مقام پر وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ فرما کر غلاظت سے اجتناب کا حکم دیا جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ معیشت کی تباہی مول لے چکے تھے۔ ان کا طرز و اطوار۔ رہنا سہنا۔ ان کے لباس۔ ان کے وجود۔ ان کے گلی کوچے اور ان کے شہر و بازار غلاظت کا شکار ہو چکے تھے۔

ہدایت صرف زبان ہی سے نہیں ہوتی بلکہ اشارات، کنایات، حرکات، سکنات، ہجرت، طہارت، لباس کی پاکیزگی، رہنے سہنے، اُٹھنے، بیٹھنے، چلنے پھرنے اور پاکیزہ ماحول کے ساتھ ہوتی ہے ہر شفیق اپنے عزیزوں کو سمجھانے کیلئے جو طریقے اختیار کرتا ہے وہ سب بُرائیوں کو دُور کرنے کیلئے جہاد کا حکم رکھتے ہیں۔ قانونِ فطرت نے ہمیشہ ترغیب کیلئے حسین و جمیل صورتوں کے ساتھ نیکیوں کی طرف بلایا اور سخت خوفناک حالتوں میں سخت جلال کی صورت میں بُرائیوں سے بچانے کیلئے ترہیب کی صورت اختیار کی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بچپن سے بعثت تک امین ہونا بُرائیوں کی مدافعت کے لئے نبوت کا پیش خیمہ ہے اور آپ کی نبوت نے اسی پیش خیمہ پر لوگوں کو بلایا اور ان میں رسالت یعنی آخری رسالت کا دعویٰ کیا۔ اس آوازِ حق کے ساتھ آخری ہدایت فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوئی اور انسانی عادات کے مطابق ان انسانوں کو ان الفاظ کے ساتھ دعوتِ حق دی اور فرمایا "اے لوگو!

اگر میں تمہیں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے غنیم ہے جو تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو کیا تم میری اس بات کو تسلیم کر لو گے؟

یہ دعوت صداقت پر مبنی تھی چونکہ جو بلندی پر ہوتا ہے اس کے سامنے نشیب و فراز ہوتے ہیں اور جہاد کی ترجمانی اُسی کا حق ہوتا ہے۔ آپؐ بظاہر مادی دُنیا میں ایک پہاڑی کی چوٹی پر تھے جو بلندی و ترجمانی کی علامت ہے۔ مگر آپ عالمِ معنویت میں رشد و ہدایت کی اس بلندی پر فائز تھے جس کو پروردگارِ عالم نے ختمی بلندی کہا ہے عالمِ دُنیا کی بلندیوں سے اوجھل رہنے والی باتوں کی ترجمانی سوائے بلندیٔ نبوّت کے ناممکن ہوتی ہے۔

عالمِ معنویّت کی نامعلوم دنیاؤں کی خبر بھی بغیر ختمی بلندی کے میسّر نہیں آ سکتی اس تمثیل کی ضرورت حضور علیہ الصّلوٰۃ والسلام کو تسلیم و رضا کیلئے درپیش آئی چونکہ آپؐ نبوّت کی بلندی کا اظہار کرنے والے تھے اور اس کے جہاں کی نامعلوم اخبار کے ساتھ دعویٰ نبوّت کرنے والے تھے جس کی شہادت کیلئے مجازاً ایک ایسی دلیل سے منکرین کے اذہان کو قبل از دعویٰ میدانِ تسلیم میں لے آئے کہ جس دلیل کے بعد دعویٰ کی ضرورت درپیش آ سکتی تھی۔ عقول کو فنادِ دلیل میں ڈالنے سے پہلے فنادِ عقل کا فیصلہ کیا۔

حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے اس فرمان کے بعد سب نے اتفاقِ رائے سے آواز بلند کی کہ آپ بچپن سے صادق و امین ہیں۔ اس واسطے ہم آپؐ کی بات کو ضرور تسلیم کریں گے اور اس کے بعد حضورؐ نے فرمایا کہ اگر تم میرے صادق و امین ہونے کے معتقد ہو اور مجھ پر یقین رکھتے ہو تو میں تمہیں کہتا ہوں کہ میں اللہ کی طرف سے تم پر نبیؐ بنا کر بھیجا گیا ہوں تم مجھے اللہ کا نبی تسلیم کرو اور حق کی طرف آ جاؤ۔

یہ صحت مندانہ فکری جہاد تھا جو میدانِ عمل میں کیا گیا۔ حق آ گیا اور باطل

لرزہ برا ندام ہو گیا قلوب و عقول میں کھلبلی مچ گئی۔ یہی کھلبلی حق و صداقت کا باطل کے ساتھ جہاد تھا۔ یہی زلزلہ تھا۔ جس نے بعد میں انسانی صلاحیتوں کو باطلانہ اذہان سے باہر نکالا اور راہِ حق دکھایا اس کے بعد کچھ مدت تک باطل جمع ہو کر آپ سے برسرِ پیکار ہوا اور آپؐ بُطلانِ انسانیت سے شفیقانہ جہاد کرتے رہے حتیٰ کہ ترکِ وطن کے ساتھ جہاد کا زمانہ آ پہنچا۔

اپنے محبوب ترین وطنِ مالوف کو حق و صداقت کے احیأ کیلئے چھوڑنے پر آمادۂ کار ہوئے چند نفوس جنہوں نے صدائے حق قبول کرنے کے بعد جادۂ حق پر قدم رکھا تھا وہ بھی آپ کے ساتھ ترکِ وطن پر تیار ہو گئے ترکِ وطن کی صعوبتوں کے ساتھ یہ قافلہ میدانِ بدر میں پہنچا جہاں جنگ کی صورت میں جہاد کی تشکیل فرمائی تین سو تیرہ [۳۱۳] نہتے مسافروں۔ مہاجروں اور بے وطن لوگوں نے ایک ہزار آراستہ و پیراستہ مسلح فوجِ باطل سے نبرد آزما ہو کر حق و صداقت کا فاتحانہ عَلَم بلند کیا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فاتحین کی معیّت میں جب مکّہ معظمہ میں داخل ہوئے تو شفقت کریمانہ کا جنگ کے بعد اس طرح عملی ترجمہ فرماتے ہیں کہ جب دشمنانِ اسلام مجرم کی صورت میں آپؐ کے سامنے پیش کئے گئے تو آپ نے شفقتِ خداوندی اور شفقتِ والدین کی صُورت میں اپنی رافتِ کریمانہ کا ایسے الفاظِ مقدّس کے ساتھ مظاہرہ فرمایا۔ برسرِ عدالت حقہ فرمانِ مصطفویؐ بظاہر ایک مجلس کے سامنے مگر معانی میں ساری کائنات کیلئے اس طرح گونجا۔ ارشاد ہوا:-

لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ

یعنی شفیق خدا سے برتر کے۔ شفیق بندۂ فاتح کی عدالت میں جبکہ قوتِ حاکمہ اُس کے مبارک ہاتھوں میں ہے اور اپنی مقدّس زبان سے جو فیصلہ صادر فرماتا ہے اے مجرمو اجرم کے انتہا پسندو! آج تم میں سے کسی پر کوئی گرفت نہیں ہے جاؤ

تم کو معاف کیا جاتا ہے قافلۂ رسول کی محبوب ترین شخصیات کو موت کے گھاٹ اتار نے والو۔ ان کا کلیجہ چبا کر کھانے والوں کو مشفق آنکھوں نے پا کر چھوڑ دیا۔ یہ واقعہ شفقتِ مادرانہ سے کس طرح کم ہو سکتا ہے۔ اس مقام پر قرآنِ مجید کا جنگی نظامِ جہادِ جاہدِ حق کی جو ترجمانی کرتا ہے مسلمانوں کیلئے میدانِ جہاد میں اسی پر بنیادِ جہاد رکھی گئی ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی زندگی میں اپنے پیرو کاروں کے ساتھ جو غزوات انجام دیئے وہ جنگ اصولِ حق کی بنا پر سراسر مدافعتِ باطل کے لئے تھے نہ کہ مدافعتِ انسانیت کیلئے تھے۔ افعالِ قبیحہ انسانی عادات سے متعلق ہو کر انسان کی بد اخلاقیاں بنتے ہیں۔ اگر مخالفینِ اسلام جنگ کرنے سے باز آجائیں تو بلا ہلاکت قرآنِ مجید کا اسلام اُنہیں امان دیتا ہے اور قرآنِ مجید کا ارشاد ہے کہ اہلِ کفر جنگ میں صلح کیلئے ہاتھ بڑھائیں تو ان سے صلح کر لو صرف ان حالتوں میں جب وہ اپنے وعدوں سے ہٹ جائیں ان کے ساتھ جہاد کرو۔ تاکہ وہ غلط بیانی سے عوام کو دھوکہ نہ دے سکیں اس حالت پر قرآنِ مجید اس طرح ارشاد فرماتا ہے۔

وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ۔ (پ ۱۰ آیت ۱۲ التوبہ)

یعنی اگر وہ اپنے عہدِ صلح سے ہٹ جائیں اور تمہارے دین پر طعنہ بازی شروع کر دیں ایسی حالت میں ان کے رہنماؤں کے ساتھ جو کافروں کو باطلانہ طور پر عہد شکنی پر آمادہ کرتے ہیں۔ لڑائی کرو۔ اس واسطے کہ ایسے باطل پسند لوگوں کا کوئی عہد نہیں ہوتا۔ ان سے ایسی لڑائی کرو کہ وہ افعالِ کافرانہ سے باز آجائیں۔ پھر فرمایا کہ جب تک وہ جنگ میں پہل نہ کریں تم ان سے جنگ نہ کرو مگر ان کے

عہد ناموں پر بھی یقین نہ کرو اور ان کی بد عہدی سے خبردار رہو کہ وہ کبھی عہد پر ثابت قدم رہنے والے نہیں۔

اس طرح قرآنِ مجید کا جہاد جنگ کے میدان میں اخلاقی نوعیت اختیار کر لیتا ہے اور اس اخلاقی نوعیت کو سلامتی دفاع کہا گیا ہے جذباتِ انسانی کے احترام کے بعد انہیں ترہیب و ترغیب کیلئے راہِ راست کی طرف دعوت پر آمادہ کرنے کیلئے قرآنِ مجید صلح و جنگ دونوں کو اخلاقی صورت دیکر دعوتِ حق دیتا ہے مگر اس جنگ کی تدابیر حاصل کرنے کیلئے جہاد کرنے کی سخت تاکید کرتا ہے اور بغیر تربیت کے میدانِ جنگ میں جانیکی اجازت نہیں دیتا اور حالتِ جنگ میں منکرینِ حق کے ان دعوؤں کے مقابلے میں جن سے وہ اپنی برتری کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ وہ کمزور نہیں ہیں بلکہ طاقت میں تم سے بڑھ چڑھ کر ہیں اور ان کے اس دعوے کے مقابلے میں کہ وہ اپنے باطل سے حق کو مٹانے کیلئے پورے ساز و سامان کے ساتھ تیار ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے :-

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ (انفال، پ ۱۰ آیت)

یعنی ان مدعیانِ باطل کے لاف و گزاف کے ردِ عمل کیلئے تم امکانی وسائل کے ساتھ میدانِ جنگ میں نبرد آزما ہونے کیلئے تیار ہو جاؤ۔ تربیت یافتہ گھوڑوں کے ساتھ اللہ کے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو ڈرانے کیلئے کہ وہ حق کو شکست نہ دے سکیں اور اس کے علاوہ جملہ دشمنانِ اسلام کے لئے یہ تیاری کرو جس کو تم نہیں جانتے مگر وہ پیچھے رہ کر تم کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں ان کو اللہ جانتا ہے۔

اس آیت میں پورے وسائل کے ساتھ جنگ کرنے کے حکم سے ہر زمانے کے مطابق سامانِ حرب و ضرب کے حاصل کرنیکی تعلیم قرآنِ مجید سے ثابت ہو

جاتی ہے جس میں ایک چھوٹے سے ہتھیار اور ایک ذی جان سواری سے لیکر تمام بری و بحری سواریوں کا ثبوت میسر آتا ہے جن کے ساتھ جنگ لڑی جا سکتی ہے اور تمام فضائی طیاروں۔ جنگی جہازوں۔ ہائیڈروجن بم۔ ایٹم بم اور راکٹوں کا ثبوت بھی میسر آجاتا ہے جو انسانی گرفت میں آکر میدانِ جنگ میں کام کر سکتے ہیں

اس حکمِ خداوندی کے بعد ان جملہ سامانوں کو جنگ کیلئے حاصل نہ کرنا مسلمانانِ عالم کے لئے نافرمانی کی حیثیت رکھتا ہے اگر وہ امکانی استطاعت کے ساتھ جسمیں علم و ہنر اور صنعت و حرفت سب داخل ہیں حاصل نہ کریں تو اعراض عن الحکم ہو گا۔ ایسی جنگ لڑنے والے مسلمانوں کو تیار کرنے کیلئے براہِ راست سرورِ کائنات فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے۔

يَآ اَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْآ اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ آیت ۶۵ (الانفال)

"یعنی اے نبی کریم علیک السلام مومنوں کو منکرین کے ساتھ جہاد کے لئے تیار فرمائیے اگر صاحب استقامت دس مومن تم میں سے ہوں گے تو وہ سو پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں سے ایسے سو مومن ہوں گے تو وہ ایک ہزار پر غالب آئیں گے ان لوگوں پر جو کافروں سے ہیں کیوں کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نا سمجھ ہیں۔"

اس کے بعد مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی تھی اور وہ پہلی سی استقامت حصولِ تربیت کے زمانوں میں تربیت حاصل کرنے تک نہ رہی تھی تو اس حکم کو اس طرح بدل دیا گیا تھا کہ تربیت حاصل کرنے کے بغیر پہلے لوگوں کی طرح استقامت حاصل کرنے کے بغیر پہلے لوگوں کی طرح استقامت حاصل کرنے کے بغیر تم میں سے سو آدمی دو سو پر غالب آئیگا اور ایک ہزار دو ہزار پر غالب آئیگا اس کا یہ مطلب

نہیں کہ پہلی عادت منسوخ ہو گئی بلکہ اس سے تربیت کمال مراد ہے۔

بعد کی جنگ میں خالد ابنِ ولید نے پہلے تناسب کو ثابت کر دیا اور بھارت سے ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہماری پاکستان کی لڑائی نے بھی اعلیٰ قیادت کے ساتھ اس تناسب اوّل کو ثابت کر دیا کہ ایک ۱ ہزار پر ایک ۱ سو غالب آئے۔

یہ ساری تیاری، جنگ مومن کو حسن باطن کے ساتھ اپنی داخلی خرابیوں کے ساتھ جنگ کرنے سے لیکر خارج کی بد اخلاقیوں کی مدافعت کیلئے قرآنِ مجید کے بہت سے ایسے احکام ترتیبِ جنگ پر اس انداز سے تبصرہ کرتے ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی جنگ جارحیت سے مبرّا ہے اور اس پر احتیاط برتنے کا بار بار حکم دیا گیا ہے۔

اسلام میں قتل انسان جیسا بڑا جرم بعد از شرک اور کوئی نہیں ہے جہاد کی اس تشریح کے مطابق ان اسلامی جنگوں کو جو ظاہری رسموں کے ساتھ لڑی گئی ہیں مگر ان میں جارحیت تھی قرآنِ مجید کا اسلام ان کی رواداری نہیں کرتا جس مسلمان نے خلافِ قرآن۔ خلافِ اسلام۔ خلافِ نبی آخر الزمانؐ جنگ میں جارحانہ صورت اختیار کی اس کو اللہ کے سامنے اپنے ظلم کا بدلہ دینا ہو گا کوئی مسلمان اسلام کے نام سے جارحانہ جنگ لڑ کر اللہ کی باز پُرس سے بچ نہیں سکتا مگر اسلام کی جنگ کا اختتام صُلح و امن پر ہوتا ہے۔ صُلح سے اُٹھ کر صُلح کے میدان میں رُکتا ہے۔

قرآن مجید
اور
عِلمِ غیب

علمِ غیب کا کلیتہً صرف اللہ العالمین ہی مالک ہے۔ مگر علمِ عطائی سے انکار عطائے خداوندی سے انکار ہوتا ہے۔ عالم الغیب وَالشھادۃ کی اصطلاح صرف اللہ کیلئے مختص ہے مگر متقین کے علمِ غیب کے متعلق قرآن مجید کے پہلے پارہ میں "سورہ بقرۃ" کی ابتدائی آیات میں تصریحاً بیان موجود ہے۔ جسکی موجودگی میں عطائی علمِ غیب سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اور انبیائے کرام کا علم غیب نبوّت کے بنیادی ارکان میں سے ایک ہے

بدقسمتی سے اس چودھویں صدی ہجری میں تقریباً پچاس سال سے انبیاءؑ و اولیاءؒ کرام کے عطائی علومِ باطن پر جو انہیں بالوحی اور الہامی طور پر من جانب اللہ عطا فرمائے گئے ہیں۔ علمائے اسلام میں بحث و تمحیص کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ حالانکہ انبیاءؑ کے الہامات، خواب اور کلام سب کے سب عندالقرآن وحی خفی و جلی سے تعبیر ہیں۔ اور اولیا اللہ کے کشف و کراماتِ الہامی، القائی و ہاتفی ہوتے ہیں۔ جو اِن کے اسلامی زہد و تقویٰ سے پیدا ہو کر ایزادِ کرامت برائے تبلیغِ دین بنتے ہیں۔ اور سب کے سب چاہے وہبی ہوں یا اکتسابی، نتائج کے طور پر سب کے سب من جانب اللہ عطائی ہی ہوتے ہیں۔

قرونِ اولیٰ سے اس صدی تک ان حالات و کیفیات کو عوام و خواص میں یقین اور استحسان کی نظر سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ اور اِن کے ذریعے عوام کو تحریص و ترغیب ملتی رہی۔ اس پر چنداں بحث کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ یہ حالات تعمیل احکامِ الٰہیہ کے نتیجے میں میسّر آتے ہیں۔ مگر چونکہ انسانی نظر باتی مباحث کا سامنے آتے رہنا انسانی عادت کا خاصہ رہا ہے۔ اور اِن مباحث سے علمی و معلوماتی اضافہ ہوتا ہے۔ لہٰذا مناسب ہے۔ کہ اس پر روشنی ڈالی جائے۔

"علمِ غیب" کا کُلیتہً صرف اِلٰہُ العالمین ہی مالک ہے۔ مگر "علم عطائی" سے انکار عطائے خداوندی کا انکار ہوتا ہے۔ عالم الغیب والشہادۃ صرف اللہ کیلئے مختص ہے۔ مگر مُتقین کے علم الغیب کے متعلق قرآنِ مجید کے پہلے پارہ میں سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات میں تفریحاً بیان موجود ہے۔ جس کی موجودگی

ہیں عطائی علمِ غیب سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اور انبیائے کرام کا علمِ غیب نبوّت کے بنیادی ارکان میں سے ایک رکن ہے۔

اخبار بالغیب، تبلیغِ بالاخبار اور معجزات، نبوّت کے تین بنیادی ارکان ہیں۔ ان تینوں ارکان میں سے ایک رکن کی کمی واقع ہونے سے نبوّت ختم ہو جاتی ہے۔ ہر نبیؑ کا صاحب اخبار بالغیب ہونا، ان اخبار کے مطابق تبلیغ کرنا اور منجانب اللہ صاحبِ معجزات ہونا لازم ہے۔ نبوّت کی بنائے اوّل جس پر وہ دعویٔ نبوّت کرتا ہے۔ اخبارِ بالغیب ہے۔ دوسرا درجہ تبلیغ بالاخبار ہے اور تیسرا درجہ منکرینِ اخبار کی عقول کو عاجز کرنے کیلئے صفتِ معجزانہ ہے۔

چنانچہ قرآنِ مجید فرقان حمید اور احادیثِ نبویہ سے تمام انبیاءؑ کیلئے اِن تین ارکان کو دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ایک لاکھ کئی ہزار انبیاء و مرسلین ہوئے لیکن یہ تعداد قطعیت کے ساتھ اس واسطے نہیں پیش کی گئی۔ کہ اس میں حضرت لقمان علیہ السّلام اور حضرت خضر علیہ السّلام دو ایسی شخصیات ہیں۔ جن کے متعلق اخبار بالتبلیغ اور معجزات کی مکمل شہادت نہیں ملتی بصورت دیگر ایک لاکھ چوبیس ہزار کی بجائے ایک لاکھ کئی ہزار کی تعداد بیان کی جا سکتی ہے۔

اس اعتبار سے مذکورہ ارکانِ نبوت کی موجودگی میں انبیاءؑ کے علمِ غیب سے انکار کرنا اخبار بالغیب کے انکار کے مترادف ہے۔ جس سے نبوّت کے بنیادی رکن کا انکار ہو جاتا ہے۔ اور ایسے دلائل کی موجودگی میں علماءِ معترضین کا انبیاءؑ کے علمِ غیب سے انکار کرنا نبوّت کی اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔

اللہ اور نبیؐ دونوں کی تعمیلِ حکم کی بدولت جو لوگ صدیقین اور صالحین کا مرتبہ پاتے ہیں۔ اِن کی عاداتِ کریمانہ اور کلام عارفانہ عام لوگوں کے ادراک سے بالاتر ہو جاتے ہیں۔ ان کا تقرّب حاصل کرنا علمائے حق کے لیئے ضروری ہو

جاتا ہے۔ اس واسطے کہ یہ لوگ صاحب وجدان ہوتے ہیں۔ ان سے اللہ کی محبت کی راہ ملتی ہے۔ اور ان کا تقرب کفارۂ گناہ ہوتا ہے۔

O

درحقیقت علماء ہی اولیاء اللہ ہونیکے صحیح مجاز ہیں

عارف کا عالم کے پاس بیٹھنا اور عالم کا عارف کے قریب ہونا، علمِ عالم کو عرفان کی نعمت سے مالامال کرتا ہے۔ اور عارف کو حالتِ وجدان میں علماء کی نگرانی میں شریعت کی پابندی کا شرف ملتا ہے۔ وہ اپنے سُکر کو علماء کی محفل میں صحو تک محدود رکھ کر ارکانِ شریعت کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے۔

درحقیقت علماء ہی اولیاء اللہ بن کر عارف باللہ کا مقامِ حاصل کرنیکے صحیح مجاز ہیں۔ منزلِ عرفان راہِ عمل سے میّسر آتی ہے۔ ولی اللہ جس طرح بھی ولی ہوتے۔ اس کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے علم سے بہرہ ور کیا جاتا ہے۔ اللہ اپنے کسی دوست کو بھی جہالت کے پردوں میں نہیں رکھتا۔ البتہ ان کی باتیں علماء ظاہر کی باتوں سے بالاتر ہوتی ہیں۔ جن پر بعض علماء انکی باتوں سے اختلاف کرتے ہیں۔ اس رقابت کی ترجمانی اقبال نے یوں فرمائی

رقابت علم و عرفان میں غلط بینی ہے منبر کی
کہ وہ حلاج کی سُولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا

یا ان کی باتوں کو خلافِ شرع قرار دے دیتے ہیں۔ اور ان کے الہامات اور مکشوفات سے انکار کرتے ہیں۔ اور اُن کو خلافِ شریعت ہونیکا فتویٰ دیتے ہیں یہاں علمِ غیب اور علمِ شہود کی بحث مقصود نہیں ہے۔ بلکہ صحیح منزل پر چل کر مقصودِ مطلق کو پانا ہے۔ اور اس مقصودِ مطلق کو پانے کیلئے غور و فکر کرنا تحقیقِ حق کیلئے اشد ضروری ہے

مگر جب علمائے اسلام اپنی علمی بلندیوں سے نیچے اتر آئیں اور اپنے

مباحث کو نفسانی عقل کی سطح پر پرکھنا شروع کر دیں تو بجائے استفادۂ علمی کے رقابت علم و عرفان کا دورہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور علم و عمل کے جہانوں میں ان بے جا مباحث سے اس قدر آندھیاں اور طوفان آجاتے ہیں۔ جن سے علم و عرفان کے بار آور چمن اور میسّر آئے ہوئے معلومات بکھر کر پامال ہو جاتے ہیں۔ جن کی تلافی صدیوں تک بھی نہیں ہو سکتی۔

اصطلاحِ قرآن میں مذہب کی بنیاد غیب پر رکھ کر مومن کو مستور و محجوب حالات کیلئے تجسّس کا موقع دیا گیا ہے۔ اگر بنائے اوّل علمِ شہود پر ہوتی تو تجسّس کا سوال ہی پیدا نہ ہو سکتا۔ جستجو شہود کیلئے نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ وہ تو بالکل آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔ بلکہ یہ جستجو محجوب کیلئے ہوتی ہے اس واسطے کہ شہود ظاہر ہے۔ اور ظاہر و باہر اشیا کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اور غیوب و محجوب وہ چیزیں ہیں جو قابلِ معلوم ہیں۔ ان کو معلوم کرنا فتوح الغیب کہلاتا ہے۔

اللہ کی راہ میں فتوحُ الغیب کا آغاز " يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ " سے ہوتا ہے۔ غیب پر ایمان لانا شہود کے منافی ہے۔ اور شہود پر ایمان لانا غیب کے منافی ہے۔ یہاں غیب پر یقینِ محکم کے ساتھ ایمان کی تلقین کی جاتی ہے اور تقویٰ کی شرطِ اوّل ایمان بالغیب ہے اور اس پر جن اعمال کو مرتب کیا گیا ہے۔ وہ سب کے سب مشہود ہیں۔ اس ترتیب سے جملہ اعمالِ اسلامیہ کی تعمیر علمِ غیب پر ہوئی اور جن اعمال کی تعمیر غیب پر ہو اُن کی اصل بھی غیب ہوتی ہے۔

اللہ تعالےٰ کی ذات کے سامنے ہر چیز شہود ہی شہود ہے۔ کیوں کہ اُس کے سامنے غیب کا وجود ہی نہیں۔ غیب دان کی اصطلاح اُن کے لئے ہے۔

جن پر غیب عیاں نہیں۔ اور وہ اُس کے دیکھنے کی جستجو کرتے ہیں۔ اور خدا پر ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آسکتا کہ اُس سے کوئی چیز پوشیدہ رہے۔ نہ اُس کو اُونگھ آتی ہے نہ نیند۔ یہ تصوّر بھی کرنا کہ وہ غیب دان ہے۔ اللہ تعالےٰ کے علمِ قدیم پر نقص لازم آتا ہے۔ اس واسطے کہ غیب دان کے لئے اشیاء کا مستور و محجوب ہونا ثابت ہوتا ہے۔ البتہ عالم الغیب والشہادۃ کا ترجمہ یہ ہو سکتا ہے۔ کہ جو چیزیں مخلوق سے پوشیدہ ہیں۔ وہ اللہ سے پوشیدہ نہیں وہ عَلِیمٌ بذاتِ الصدور ہے۔

اُس کا علم محیطِ کُل ہے۔ اور انبیاءؑ و اولیاءؒ کا علم اُس کی عطا ہے۔ عطا کرنا اللہ کی شان میں داخل ہے۔ عوام کو عام چیزیں عطا کرتا ہے۔ اور خواص کو خاص چیزیں عطا کرتا ہے۔ اخص الخواص کو اُن سے بھی زیادہ اعلیٰ چیزیں تفویض کرتا ہے۔ تاکہ عطائے ربّانی کے درجات کا تعارف ہو سکے۔ چونکہ اسلام میں انبیاءؑ کا درجہ سب سے بلند ہے۔ لہٰذا ان کے علوم و معارف اور مشاہدات کو بھی عوام و خواص سے بلند تر کر دیا جاتا ہے۔ اور لوگوں کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں انبیاءؑ سے جو محیّر العقول کارنامے سرزد ہوتے ہیں۔ اُن کو معجزانہ خوارقات سے تعبیر کیا گیا اور اولیاءِ عظام سے جو باتیں سرزد ہوں۔ اُن کو کرامات کہا گیا ہے۔

برخلاف ان معجزات و کرامات کے کفار کے مصنوعی احوال ساحرانہ چال کے جس قدر بھی حیرت انگیز حالات پیدا ہوں۔ تو اُن کو استدراج کہا جائے گا۔ چونکہ غیر مسلمین کی اس حیرت انگیزی کی بنیاد ایمان بالغیب پر نہیں ہوتی بلکہ خارجی مصنوعی علوم و فنون کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اس واسطے استدراج کو جزوی و کلی طور پر تبلیغ اور معجزات و کرامات سے الگ کر دیا گیا ہے۔

اسلامی تعلیمات کا مقصد تقویٰ حاصل کرنا ہے۔ اور تقویٰ وہ مقام ہے۔ جس سے خوشنودیٔ رب حاصل ہوتی ہے۔ اور خوشنودیٔ رب ہی متقی کے لئے کرامت ہو جاتی ہے۔ متقی کی خوشنودی اللہ کی خوشنودی کا ذریعہ ہے۔ اور متقی کا غضب اللہ کے غضب کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

متقیوں کی اللہ تعالے ہر حال مدد کرتا ہے۔ ان پر الہامات کا سلسلہ بھی خوشنودیٔ رب ہی کی ایک کڑی ہے۔ علمِ غیب سے مراد راہ پانے کے ہیں۔ انبیاء زیادہ راہ پاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کا قولِ قولِ خداوندی ہوتا ہے۔ اور اولیاء اللہ سب کے سب اطاعت شعار ہونے کی بدولت راہ پاتے ہیں۔ یہ علومِ تکوینیہ سے مطلع ہوتے ہیں۔

علمِ غیب اللہ کے لئے ہے۔ اس حالت میں کہ ہر چیز اللہ کے سامنے شہود ہے۔ اور علمِ غیب عطائی وہ ہے، جو اللہ کے حکم و قدرت سے میسّر آئے۔ اس عقیدے سے انکار اللہ تعالے کے علمِ شہود اور عطائے خداوندی سے انکار ہے۔

اللہ تبارک و تعالے کا علمِ شہود بلا غیب ہوتا ہے۔ اور عطائے علمِ غیب من جانب اللہ انبیاء علیہم الصّلوٰۃ والسّلام جو بات، جس وقت، اور جس حال میں کرتے ہیں، وہ وقت اور وہ حال دونوں ان کیلئے مشہود ہوتے ہیں۔ کیفیتِ مشہودہ پر علم الغیب کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ اور اولیاء اللہ پر بھی فتوح الغیب کا سلسلہ جس وقت اور جب جاری کیا جاتا ہے۔ ان پر بھی وہ وقت اور حالات کیفیتِ مشہودہ کی طرح واقع ہوتے ہیں۔ فلہذا وہ بھی جو کچھ بتاتے ہیں وہ غیب نہیں ہوتا۔

لہٰذا کوئی نبیؑ، کوئی ولی بغیر دیکھنے کے علم الغیب کی بات نہیں کرتے۔

جو چیز اُن پر واضح ہوتی ہے۔ اور جو چیز وہ آنکھ سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے ہیں۔ اس کو زیرِ عمل لاتے ہیں۔ اس طرح انبیاءؑ و مشائخؒ پر عالم الغیب ہونے کا فتویٰ نہیں لگ سکتا۔ اسی طرح شریعت میں انبیاءؑ کے مشاہدات کو قطعی کہا گیا ہے۔ اولیاء اللہ کے مشاہدات انبیاء اللہ کی طرح قطعی نہیں ہوتے مگر اُن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اولیاء اللہ کے مشاہدات درجات کے لحاظ سے بعض دفعہ سو فیصد، بعض دفعہ ۹۰ فیصد، بعض دفعہ نصف فیصد، بعض دفعہ دس فیصد اور بعض دفعہ ایک فیصد صحیح ہوتے ہیں۔ اور یہ سب انکشافات بر بنائے تقویٰ صادر ہوتے ہیں۔ جن سے تبلیغِ اسلام کا کام سرانجام دیا جاتا ہے۔ اہلِ اللہ کے نزدیک کشف برائے کشف جس کا تعلق تبلیغِ دین سے نہ ہو ناجائز ہے اور بے فائدہ ہے۔ یہ وہ کرامات ہیں۔ جو کلمہ طیبہ سے شروع ہو کر مومن کے اقوال و افعال کی صورت بن کر آخرالامر خوارقات بن جاتے ہیں۔ چنانچہ سورۃ بقر کی ابتدائی آیات کو ایمان بالغیب کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہوئے مزید روشنی ڈالی جاتی ہے۔

الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۙ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۙ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

سورہ بقرکی اِن آیات کا ترجمہ یہ ہے کہ" یہ وہ کتابِ مُقدس ہے۔ جس میں کسی قسم کا شک و شُبہ نہیں ہو سکتا۔ اور اس میں کسی قسم کے شک اور غلطی کی گنجائش نہیں ہے۔ اور اس کتابِ مقدس کی ہدایات متقیوں کے لیۓ مختص ہیں وہ پرہیزگار جو خدا تعالےٰ کی ذات پر بِن دیکھے ایمان لاتے ہیں۔ اور اللہ نے جو کچھ دے رکھا ہے۔ اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ اور اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ جو آپ پر نازل ہوئی۔ اور اس سے پہلے جو کتابیں نازل ہوئی ہیں۔ یعنی توراۃ، زبور، انجیل اور دیگر کتبِ سماویہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور یومِ آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں۔

ان لوگوں کے متعلق اس سورۂ مقدسہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ کہ اس قسم کے ایمانیات والے لوگ ہی فلاحِ دارین کے حق دار ہیں۔ جو لوگ اس کے خلاف چلنے والے ہیں۔ قرآنِ مجید میں اُنہیں کافر کہا گیا ہے۔ یعنی وہ دیدہ دانستہ پروردگارِ عالم کے حق ہونے سے انکار کرنے والے اور اللہ کی ہدایت سے پھر جانے والے ہیں۔

یہ قرآنِ مجید وہ قرآنِ موعُود ہے۔ اللہ تبارک تعالےٰ نے انبیائے ماسبق اور اُن کی اُمتوں سے وعدہ فرمایا تھا۔ تمہیں نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ واصحابہ وسلّم کے ذریعے ایک کتاب بھیجوں گا۔ جو آخری کتاب ہو گی۔ جس وقت یہ کتاب نازل ہوئی تو اللہ تعالےٰ نے یہود و نصاریٰ کو اپنا وعدہ یاد دلایا۔ کہ یہ کتابِ موعود وہی ہے۔ جس کے متعلق میں نے تم سے وعدہ کر رکھا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔

اس کتابِ مقدس میں جو الفاظِ مبارک الٓمّٓ تا وَالنَّاس ہیں۔ وہ قرآنِ مجید ہیں۔ اور قرآنِ مجید اپنے جُملہ اجزاء کے ساتھ کتابِ موعود ہے۔ اور

ساری کی ساری کتاب اور اس کے اندر جو کچھ بھی ہے۔ وہ سارے کا سارا اتقیا کیلئے ہے۔ اور سب سے زیادہ اگر اس سے انتفاع کرنیوالے لوگ ہیں۔ تو وہ اللہ کی ذات پر ایمان رکھنے والے لوگ ہیں۔ کیونکہ تقویٰ وہی تقویٰ کہلا سکتا ہے۔ جو شریعت سے اخذ کیا جائے۔ اگر خارجی ہو، تو اس پر تقویٰ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ شرعی حدود کے اندر رہ کر شرعی امور کے تابع احکام کی تعمیل کی جائے تو اس کو تقویٰ کہتے ہیں۔ یہ احکام چاہے عبادت سے متعلق ہوں یا معاملات سے۔

ان لوگوں کو متقی کہا جاتا ہے۔ جو شریعت کی روشنی میں کام کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے متعلق ارشاد فرمایا۔ کہ یہ کتاب مقدس ان لوگوں کے لئے ہدایت کا سامان ہے۔ جو شریعت کی روشنی میں اللہ تبارک وتعالےٰ کی عبادت کرنے والے اور شریعت کی روشنی میں انسانیّت کی خدمت کرنے والے ہیں۔ ان کے سوا جو لوگ ہیں۔ انہیں متقی نہیں کہا جاتا۔ وہ متقی جو شریعت کی روشنی میں اپنے لئے اقوال و اعمال تجویز کرتے ہیں۔ ان کی کیا تعریف ہے؟ فرمایا
ان کی تعریف یہ ہے۔ کہ اللہ تبارک تعالےٰ کی ذات واجب الوجود پر بغیر دیکھے ایمان لائیں۔ یہی ایمان بالغیب ہے۔ جو مسلمانوں کی جماعت کا بنیادی مسئلہ ہے۔ اگر "یُؤْمِنُوْنَ بِالشُّهُوْد" ہوتا پھر شہود سے بات شروع ہوتی۔ اور یُؤْمِنُوْنَ بِالشُّهُوْد ہوتا تو اللہ کی ذات کو دیکھ کر آسمان سے کتابیں اُترتی ہوئی دیکھ کر اور آخرت کا مشاہدہ کر کے لوگ ایمان لا سکتے تھے۔ یا قبریں اُٹھتے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر بعثت بعد الموت پر ایمان لاتے۔ اس کو یُؤْمِنُوْنَ بِالشُّهُوْد کہا جاتا۔
لیکن اللہ تبارک تعالےٰ چونکہ پوشیدہ ہے۔ حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم اور

تمام انبیاءؑ علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کو نبوت کی مہریں لگائی گئیں یا نبیؑ بنا کر بھیجا گیا۔ تو انہوں نے آکر اپنی مبارک زبانوں سے کہا کہ ہم نبیؑ ہیں۔ وہ معجزات بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔ اور دلائل بھی جو عین فطرت تھے۔ مگر اُن کو مہرِ نبوت لگتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ اس دعویٔ نبوت کے بعد بعض لوگوں نے اُنہیں تسلیم کیا اور بعض نے تسلیم نہیں کیا۔ جنہوں نے تسلیم کیا انہوں نے بالغیب ہی تسلیم کیا۔ کیوں کہ وہ اس وقت موجود نہ تھے۔ جس وقت اُن کو نبوت تقسیم ہو رہی تھی۔ اس واسطے یہ ایمانیات سب کے سب "یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ" ہیں۔ غیب کے معنی پوشیدہ کے ہیں۔ تمام لوگ جانتے ہیں کہ اعدام متقابلہ، مدِمقابل کے چھوٹے چھوٹے غیوب سے لیکر اللہ کی ذات تک سب چیز پر غیب کا لفظ بولا جاتا ہے۔ سب لوگ سمجھتے ہیں کہ ساری زمین جس پر لوگ بستے ہیں۔ اس کے اندر خزانے ہیں۔ لیکن لوگ اُن کو دیکھ نہیں سکتے لہٰذا وہ غیب ہیں۔ طبقات الارض میں بہت سی ایسی اشیاء ہیں۔ جو مستور و محجوب ہیں۔ ان سب پر غیب کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہاں یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ فرمایا گیا ہے۔ ہمارا ایک ایمان نہیں۔ بلکہ بہت سے ایمان ہیں۔ ایمان کے متعلق آپ نے صفتِ ایمانی میں پڑھا ہے "اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ" یہ واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ کہ میں فردِ واحد اپنے حواسِ خمسہ کی درستی کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ میں اللہ کی ذات واحدہٗ لاشریک پر ایمان لاتا ہوں کہ وہ ایک ہے۔ حالانکہ میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا ہے "وَمَلٰٓئِکَتِہٖ" اور اُس کے فرشتوں پر بھی ایمان رکھتا ہوں۔ حالانکہ میں نے اس کے فرشتوں کو بھی نہیں دیکھا ہے۔ "وَکُتُبِہٖ" اور اُس کی جتنی کتابیں آسمان سے اُتری ہیں۔ ان سب پر ایمان رکھتا ہوں حالانکہ اس کی ایک بھی کتاب کو آسمان سے اُترتے نہیں

دیکھا ہے۔ وَرُسُلِہٖ اور اُس کے ایک لاکھ کئی ہزار انبیاءؑ و رُسل پر ایمان رکھتا ہوں۔ حالانکہ ان میں سے کسی ایک پر بھی مہرِ نبوت ثبت ہوتے نہیں دیکھا کہ کب مہر نبوت ثبت کی گئی ہے۔ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یہ تو بعد میں آنے والا مسئلہ ہے۔ مستقبل کی ہر چیز ہم سے پوشیدہ ہے۔ اور قیامت ہم سے دُور ہے۔ آنے والے زمانے میں آئے گی۔ اس پر بھی ہم ایمان رکھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ میں ایک فردِ واحد آخرت پر ایمان رکھتا ہوں۔ جو آئندہ آنے والی ہے۔ یہ بھی ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے۔ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ نیکیاں اور بدیاں اللہ کی مخلوق ہیں۔ اور اللہ ہی کی طرف سے ہیں۔ ہمیں اس کے متعلق بھی علم نہیں ہے۔ اللہ کا حکم ہے۔ کہ وہ اس کی طرف سے ہیں۔ لہذا ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ بھی بالغیب ہے۔ وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ مرنے کے بعد اُٹھنے پر ایمان رکھتا ہوں۔ حالانکہ کسی شخص کو مرنے کے بعد اُٹھتے ہوئے کسی نے بھی نہیں دیکھا۔

قرآنِ مجید میں فرمایا گیا ہے۔ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وہی متقی ہیں جو بن دیکھے ایمان رکھنے والے ہیں۔

اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَ صِفَاتِہٖ میں اللہ جس کو میں نے کبھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ اس کی ذات پر ایمان رکھتا ہوں۔ ایسے ایمان رکھتا ہوں جیسا کہ وہ اپنے اسما وصفات کے ساتھ ہے۔ جس طرح شریعت نے فرمایا ہے۔ کہ اس کے اسماء بھی ہیں۔ اور صفات بھی ہیں۔ ہم نے اللہ کو دیکھا نہیں ہے۔ اس کی صفات اور اس کے اسماء کے ساتھ اس پر ایمان بالغیب رکھتے ہیں۔

وَقَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ اس کی طرف سے جتنے بھی احکام انبیاء

کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کے ذریعے دنیا پر نازل ہوئے۔ ان سب پر ایمان لاتا ہوں۔ ان سب کو قبول کرتا ہوں۔ اور یہ قبولیت اس طرح ہے کہ میں ایسے ایمان لاتا ہوں۔ جیسے ان کو دیکھ چکا ہوں، بلکہ دیکھنے والوں سے زیادہ پختہ ایمان لا چکا ہوں۔ قبول اسی چیز کو کیا جاتا ہے۔ جس پر انسان تصدیق کرے۔ یہ تصدیق زبان سے ہی نہیں بلکہ میں دل کے ساتھ تصدیق کرتا ہوں تاکہ منافقت سے بچ سکوں۔ یہ ایمانیات ہیں جو سب کے سب بالغیب ہیں۔

شریعت کی روشنی میں تعلیم دیئے گئے ہیں۔ یہ خارجی تعلیم نہیں ہے۔ دُنیا کا کوئی عالم فاضل، کوئی دیدہ ور، کوئی مسلمان مفکر ثابت نہیں کر سکتا کہ ایمانیات کی جو یہ تعلیم دی گئی ہے۔ وہ اسلام کی داخلی نہیں بلکہ خارجی ہے۔ یہ داخلی شرعی تعلیمات میں سے ہے۔ اور اسی پر اعمال کی تعمیر کی جاتی ہے۔ جس پر جمہور علماء کا اتفاق ہے۔

فرمایا گیا کہ جو شخص غیب پر اپنے ایمان کو مضبوط نہ کر سکے اور اُس پر استقامت حاصل نہ کر سکے۔ عالمِ شہود میں، عالمِ ہست و بود میں وہ اعمال کو شرعی اُمور پر مُتشکل نہیں کر سکتا۔ بلکہ جو شخص بنیادی امور پر ایمان نہیں رکھ سکتا اسے اعمالِ شرعیہ کی تعمیل کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ وہ اتقیاء جو شرعی روشنی میں فیصلہ زندگی کرنے والے لوگ ہیں۔ ان کی تعریف یہ ہے۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بن دیکھے ایمان لانے والے لوگ ہوتے ہیں۔

درحقیقت ادائیگی نماز بھی بالغیب ہے

یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ کے الفاظ مبارکہ ہیں۔ ہم سب کو علم ہے۔ اور سارے علمائے کرام نے آج تک یہی تعلیم دی ہے۔ کہ نماز اللہ کی پڑھی جاتی ہے۔ غیر کی نماز نہیں ہوسکتی۔ اب آپ جس معبود کی نماز پڑھ رہے ہیں۔ وہ آپ کا ان دیکھا معبود ہے۔ تو پھر اس کی نماز بھی بالغیب ہوئی۔ جسے آپ نے دیکھا ہی نہیں ہے۔ اُس کی نماز پڑھ رہے ہیں۔ اس لئے ثابت ہوا کہ نماز بھی بالغیب ہے۔

وَیُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقۡنٰھُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ نماز قائم کرتے ہیں۔ اور جو کچھ اللہ تعالےٰ نے اُن کو دیا ہے۔ یعنی جان ومال واولاد، سامانِ زندگی اس میں سے وہ اللہ کے راستے میں انفاق کرنے والے ہیں۔ اور انفاق شریعت میں وہی ثواب سمجھا جاتا ہے۔ جو اللہ کے لئے دیا جائے۔ لیکن جس اللہ کو آپ نے نہیں دیکھا۔ اُس کی راہ میں انفاق بھی بالغیب ہوا۔

وَالَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ

اے محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے اُوپر جو آخری کتاب یعنی قرآن مجید نازل ہوئی۔ اس پر بھی پورا یقین رکھنے والے ہیں۔ یہ ایمان بالکتاب، کتاب سے متعلق ہے۔ اور نزول اس اللہ کی طرف سے ہے۔ جس کو کسی نے نہیں دیکھا۔ کتاب پر ایمان لانا بھی بالغیب ہی ٹھہرا۔ کیوں کہ کتاب کو اُترتے ہوئے ہم نے نہیں دیکھا۔ جب آخری نبی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم پر آخری مُہر نبوت لگ گئی۔ اُس وقت بھی ہم موجود نہ تھے۔ یا ہم کو دکھا کر مہر ثبت

نہیں کی گئی تھی۔

قرآنِ مجید کے متعلق اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتے ہیں۔

یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ

اے محبوب میں نے آپ کو جو فرمان جاری کئے ہیں۔ ان کو لوگوں تک ٹھیک ٹھیک پہنچا دیجئے۔ حضورؐ اکرم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم فرمانِ الٰہی کے مطابق اس کتابِ مقدس کو لائے اور اس کے احکام دنیا تک پہنچا دیئے۔

اس سے قبل یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے زمانے سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام پر انجیل نازل ہوئی۔ اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ الصّلوٰۃ والسّلام پر تورات نازل ہوئی۔ یہ ہیں وہ کتابیں جن کو نازل ہوتے کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ مگر ان کے متعلق فرمایا گیا کہ تمہیں ضرور ان پر ایمان لانا ہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک پر بھی ایمان نہیں لاؤ گے تو تم صاحبِ ایمان ہی نہیں رہو گے۔ اور یہ بھی ایمان بالغیب ہے۔

وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ سارے جہان کے مسلمان جانتے ہیں کہ قیامت آئے گی ہم مریں گے۔ مرنے کے بعد برزخ کی زندگی آئے گی اس کے بعد میدانِ حشر آئے گا۔ جزا اور سزا کا وقت آئے گا۔ اگرچہ یہ سب کچھ ہم سے پوشیدہ ہے۔ لیکن ہم قیامت پر اس طرح ایمان لا رہے ہیں جیسے کہ وہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ اگر ہم اس میں شک جانیں۔ تو ایمان میں نقص واقع ہو جائے گا۔

یہ بالغیب ایمانیات ایک مومن کے لئے شرطِ اوّلین قرار دی گئی ہیں۔ اور ایسے لوگوں کو ہی متقی کہا گیا ہے۔ یعنی وہی شخص متقی ہو سکتا ہے۔ جو ان غیوب پر ایمان لائے۔ ان آیات میں ایمان بالغیب کی چھ قسمیں بیان فرمائی گئی ہیں۔

فرمایا: اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ان ہی ایمانیات پر استقامت پانے والے مومنین یعنی ایمان والے لوگ فلاح و نجات پائیں گے۔ برخلاف اس کے جو لوگ مظاہراتِ عالم کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ لیل و نہار کی گردش دیکھتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں۔ کہ ایک معصوم بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اُنکی

آنکھوں کے سامنے بڑھتا ہے۔ اور تابناک جوانی حاصل کرتا ہے۔ وہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ ان مظاہرِ عالم کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ جو خود دلیل ہیں۔ منظوماتِ عالم اس امر کی دلیل ہیں۔ کہ کوئی ناظم ان کے پیچھے موجود ہے۔ باوجود ان دلائل کے جو لوگ انبیاءِ کرامؑ کی فطری تعلیم سے انکار کرتے ہیں۔ اور خدا کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کو منکرین کہا گیا ہے۔

پہلے مومنین کا ذکر کیا۔ پھر اتقیاء کے لئے ہدایاتِ سماوی کو مختص فرمایا کہ اگر بالاختصاص ہدایت حاصل کرنیوالے ہیں۔ تو وہ متقی اور پرہیزگار ہیں۔ اس میں متقی کی تعریف بیان کی ہے۔ کہ متقی وہ ہو سکتا ہے۔ جو اپنے اقوال و افعال کو شریعتِ اسلام کی روشنی میں سرانجام دے۔ متقی شریعت کی روشنی میں اللہ پر ایمان لاتا ہے۔ اور ہر غیب پر جس کی شریعت نے نشان دہی کی ایمان لاتا ہے۔ شہود کا کہیں شائبۃً بھی ذکر نہیں ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہٗ سے لیکر ایک عام مسلمان نے آج تک یہی فیصلہ کیا ہے یعنی یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ آپؓ کو صدیق اس لئے کہا گیا ہے۔ کہ آپ نے ایک خواب دیکھا تھا۔ کہ آپ دربارِ مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ خواب بیان فرما دیا۔ آپ نے تصدیق کر لی۔ خدا کو بھی مان لیا، یومِ آخرت کو بھی اور آپ صدیق ہو گئے۔

خلفائے راشدینؓ جملہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین ایمان بالغیب رکھتے تھے۔ اِن میں ایک مومن بھی ایسا نہیں تھا۔ جو ایمان بالشہود لایا ہو۔ یاد رکھنا ایمانیات کا شہود صرف انبیاءؑ کے لئے ہے۔ اور ایمان بالغیب اُمت کے مومنوں کے لئے ہے۔ کہ وہ حق کو بن دیکھے، بن مَس کئے، بن ٹٹولے تسلیم کر لیں۔

اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ o

ترجمہ :- یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

برخلاف اس کے جو لوگ مظاہراتِ عالم کو دیکھتے ہوئے انبیاءؑ کی فطری تعلیمات کو پاتے ہوئے بھی خدا کی حقانیّت سے انکار کرتے ہیں۔ وہ دیدہ ودانستہ حق سے اعراض کرنیوالے ہیں وہ کافر ہو گئے۔ اور مومنِ حقانیّت سے دیدہ ودانستہ غیبی حقائق پر ایمان لاتے ہیں۔

فاترالعقل اور مجنون انسان غیر مکلّف قرار دیئے گئے ہیں۔ کہ اگر وہ اسلام قبول نہ کریں۔ تو اُن پر کافر ہونیکا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ لیکن جو صحیح العقل بھی ہوں۔ اور کفار کے زُمرے میں داخل ہوں۔ اُن کو مکلّف قرار دیا گیا ہے اُن کو اسلام میں کافر قرار دیا گیا ہے۔ جو دیدہ دانستہ حق سے اعراض کریں اور فطری تعلیمات سے مُنہ موڑیں۔ اس آیت کا ترجمہ یہ ہے۔ کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دیدہ دانستہ حق سے اعراض کرنے والے منکرین حق کو برابر ہے۔ کہ آپ ڈرائیں یا نہ ڈرائیں۔ وہ ایمان لانیوالے نہیں ہیں۔ اُن کی مثال ایسی ہے۔ کہ انسان سچّی نیند سویا ہوا ہے۔ اگر اُس کو جگایا جائے وہ جاگ اُٹھے گا۔ لیکن ایک شخص سویا ہوا نہیں ہے بلکہ ویسے ہی

دوسروں کو فریب میں ڈالتا ہے۔ دیکھنے والا اس کو نیند میں مبتلا سمجھ کر آواز سے جگانا چاہتا ہے۔ مگر وہ نہیں جاگتا۔ اسے بار بار آواز دی جاتی ہے۔ وہ پھر بھی نہیں جاگتا۔ وہ کیا جاگے جو دیدہ دانستہ ضد کر رہا ہے۔ اس کو جگانا نہ جگانا دونوں برابر ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی کافر کو مسلمان نہیں کر سکتے تھے۔ معجزے کے معنی اسلامی تعلیمات میں کسی چیز کی ذات کی ہیئت اصلیہ کو تبدیل کر دینے کے ہیں۔ خواہ وہ ذاتِ شے مادّی ہو یا روحانی یا کسی وقت بھی واقع ہونے والی ہو۔ مختوم ازل ہو۔ یا غیر مختوم۔ چونکہ وہ اپنی ذات میں پیکرِ شے ہے۔ یعنی ہر ذاتِ شے کو معجزہ بدل سکتا ہے۔ ان لوگوں کو مختومِ ازل اس لئے کہا گیا ہے۔ کہ وہ دیدہ دانستہ ضد کرنیوالے ہیں۔ باوجودیکہ وہ جانتے ہیں۔ کہ آپؐ سچے نبیؐ ہیں۔ وہ خدا کی وحدانیت کو بھی جانتے ہیں۔ لیکن دیدہ دانستہ ضد کرتے ہیں۔ اس واسطے میں نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے۔ وہ مختوم ہیں۔ جن کو سزا کے طور پر مختوم کر دیا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

مومن اور کافر میں کیا فرق ہے؟

مومن وہ ہے۔ جو اللہ تعالےٰ پر شریعت کی روشنی میں بن دیکھے ایمان لائے۔ فرشتے اللہ کی مخلوق ہیں۔ خالق نہیں ہیں۔ اس مخلوق پر ایمان لانیکی ہمیں تاکید فرمائی گئی ہے۔ خالق کی موجودگی میں مخلوق پر ایمان لانے کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن اسے بھی بنیادی ایمانیات میں داخل کر دیا گیا ہے۔ سب انبیاء و مرسلین اللہ کی مخلوق ہیں۔ ان سب پر ایمان لانے کے متعلق حکم دیا گیا ہے۔ اور ان جملہ ایمانیات میں سے کسی ایک سے انکار کرنا سب ایمانیات سے منکر ہونے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔

مثال کے طور پر ایک شخص اللہ تعالےٰ پر ایمان لانے کے بعد فرشتوں پر ایمان لانے سے انکار کرتا ہے۔ تو وہ عندالاسلام کافر ہے۔ اور اس کو منکرِ توحید قرار دیا جائے گا۔ ایک شخص یہ کہتا ہے۔ کہ میں اللہ پر ایمان رکھتا ہوں لیکن انبیاء پر نہیں رکھتا۔ عندالاسلام وہ بدستور غیر مسلم ہے

یہ بنیادی اور تفصیلی عقائد ہیں۔ جنہیں تسلیم کرنا ضروری ہے اور ان تمام عقائد کی جڑ توحید ہے۔

اب بحث طلب بات یہ ہے۔ کہ ہمارا بنیادی مسئلہ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ ہے یُؤْمِنُوْنَ بِالشُّہُوْد نہیں ہے۔ تو پھر ترجمہ یہ ہوا کہ ہمارے جملہ اعمالِ اسلامی کی تعمیر صرف یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ پر ہی قائم کی جا سکتی ہے۔ اگر آپ جائیداد تقسیم کر رہے ہیں۔ یتیم کے مال کی حفاظت کر رہے ہیں۔ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت کر رہے ہیں۔ اولیائے کرام اور انبیاءِ عظام کی عزت کر رہے ہیں۔ تو اس کے معنی یہ نہیں کہ آپ شرعی روشنی میں ایسا کر رہے ہیں اور شرعی تعلیم وہ ہے۔ جو "علّام الغیوب" کی طرف سے بھیجی گئی ہے۔ یہ بیان اس واسطے ہے۔ کہ لوگ بنیادی طور پر علمِ غیب سے واقف ہو جائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ساری ہی ملّتِ اسلامیہ علمِ غیب پر اپنے اعمال کی بنیاد رکھتی ہے۔ دنیا کا کوئی مسلمان اگر صریح طور پر کہے کہ میں علمِ غیب پر اپنے اعمال کی بنیاد نہیں رکھتا کہ یہ قرینِ انصاف نہیں ہے۔ تو ایسا آدمی عندالاسلام مسلمان ہی نہیں ہو سکتا۔ اور اُس کے جملہ اعمال بھی کفر پر مبنی ہوں گے۔

تعلیماتِ اسلام میں یہ بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ مطلقاً عالمُ الغیب ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی بھی ضروری ہے کہ ایک علمِ ناقص ہے اور ایک علم کامل ہے صرف خدائے تعالیٰ کا علم ہی اس کی صفت نہیں ہے بلکہ طاقت و قدرت اور غنا بھی اور خبیر و علیم ہونا اور ستّار و غفّار ہونا اور جبّار و قہّار ہونا اور سمیع و بصیر ہونا بھی اُس کی صفات میں داخل ہے۔ صرف اسکی ذات کو عالم الغیب تک محدود کر دینا کہ وہ صرف عالم الغیب ہے۔ اور انبیاءؑ و مُرسلینؑ، اولیا اللہ عطائی طور پر عالمُ الغیب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی

مخلوق کو اپنی بہت ساری صفات کے ساتھ متخلق فرما دیا۔ اور اُسے طاقت بھی عطا فرمائی ہے۔ مگر سب جانتے ہیں۔ کہ یہ صفات خداداد ہیں۔ اور عطائی ہیں۔ ان سے انکار کرنا کفر ہے۔ اس پر بحث کرنا بھی قرینِ کفر ہے۔ کہ مخلوقات کی صفات عطائی ہیں۔ ایک عام صفت سے خاطن الخاص صفت تک ایک ادنیٰ علم سے اعلیٰ ترین علم تک نحو منطق و معقول اور بڑے سے بڑے علم و عرفان سب کی سب صفات عطاءِ الٰہی ہیں۔ تو اس پر زیادہ بحث کرنا ناجائز ہے۔ علم معرفت کے ساتھ خدائے لم یزل کا تقرب حاصل ہوتا ہے۔ علم سے اللہ کو معلوم کرنا علم الیقین ہوتا ہے۔ اور مجاہدات سے جو علم ملتا ہے۔ اُسے عین الیقین کہتے ہیں۔ جس علم سے مظاہراتِ عالم کے بعض اسرار و بھید صاحب علم پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اپنی آنکھوں سے مشاہدات کرنے لگتا ہے۔ تو اس کا علم یقین اس قدر پختہ ہو جاتا ہے کہ کوئی چیز اس کے ایمان کو متزلزل نہیں کر سکتی۔ جس کے بعد وہ حق الیقین کے مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔

اللہ کے علم کی تعریف یہ ہے۔ کہ وہ عالمِ مطلق اور عالمِ حقیقی ہے۔ اُس کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔ عالمین کی کوئی چھوٹی یا بڑی چیز ایسی نہیں۔ جو اللہ تعالےٰ کی آنکھوں سے ایک لمحہ کیلئے بھی اوجھل ہو۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے مختلف علوم لوگوں میں تقسیم کر دیئے ہیں۔ قرآنِ مجید تو کلامِ الٰہی ہونے کی حیثیت سے اللہ کا کلام ہے کوئی غیر اس کے علم کا کیسے عالم بن سکتا تھا۔ علمِ قرآن تو خود علمِ غیب ہے۔ اس کا عالم یقیناً علمِ غیب کا عالم قرار دیا جائیگا عالمِ قرآن کو عالمِ کل تو نہیں کہہ سکتے۔ مگر ازلی ابدی اور سرمدی کتاب کا عالم تو کہنا پڑے گا۔ کوئی شخص ان سب علوم سے زیادہ پڑھ لیتا ہے

تو اس کو بڑا عالم کہا جاتا ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ فاضلوں کا فاضل ہے مثال کے طور پر آپ کے شہر میں وکیل موجود ہیں حالانکہ وکیل اللہ تعالٰی کی صفت ہے۔ کوئی مقدمہ ہو تو آپ وکیل کے پاس لے جاتے ہیں۔ اُس کو وکیل کہنے سے شرک لازم نہیں آتا۔ کیوں کہ اللہ نے محدود طور پر اس کو علمِ وکالت دیا ہے۔ پھر وکیلوں میں ایک بڑا وکیل ہوتا ہے۔ عالموں میں ایک بڑا عالم ہوتا ہے۔ حکیموں میں ایک بڑا حکیم ہوتا ہے۔ طاقتوروں میں ایک بڑا طاقتور ہوتا ہے۔ غنیوں میں ایک بڑا غنی ہوتا ہے۔ خدائے تعالٰی نے احکم الحاکمین فرما کر یہ ثابت کر دیا ہے۔ کہ دنیا میں اور بھی حاکم ہوں گے۔ لیکن ان کی بادشاہتیں عطائی ہوں گی۔

حاکم اللہ کی صفت ہے۔ جابر اللہ کی صفت ہے۔ قادر اللہ کی صفت ہے۔ اور اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ مگر اللہ تعالٰی جس کو عطا کر دے اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ اب علمِ غیب کی تعریف یوں ہو گی۔ کہ صفاتِ انبیاءؑ صفاتِ خداوند ذوالجلال کا مظہر ہوں گے۔ اللہ تعالٰی نے انبیاءؑ کو سب مخلوق سے زیادہ علم عطا فرمایا۔ چنانچہ قرآنِ مجید ناطق ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے لئے۔ " وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا " یعنی آدم علیہ السلام کو اللہ نے جملہ اشیاء عالمین کے نام سکھا دیئے تھے۔ حالانکہ آدم علیہ السلام ایک لاکھ کئی ہزار نبیوں کی نبوّۃ کا ایک جز تھے۔ ایک لاکھ کئی ہزار انبیاء مل کر ایک محمد مصطفٰے صلی اللہ تعالٰے علیہ وآلہ وسلم کی نبوّۃ بنتی ہے۔ اگر ایک جزوِ نبوّت کو اتنا علم بخشا جاتا ہے۔ کہ اس کی وسعتوں، پہنائیوں اور گہرائیوں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوّۃ کے علم کا اندازہ کوئی کیسے کر سکتا ہے۔ جو نبوّۃ کُل کے مالک ہیں۔ ارشادِ

باری ہوتا ہے۔ "وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا" سب لوگ اس بات کو جانتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز ایسی پیدا نہیں کی جس کا نام نہ ہو۔ لوحِ محفوظ میں جو نام لکھے ہوئے ہیں۔ وہ ہجوں میں ہیں۔ ہجوں سے ترتیب دیئے گئے ہیں۔ وہاں بھی الف ب سے کام کیا گیا ہے۔ الف ہجہ ہے اور اس کا اسم الف ہے۔ ب ہجہ ہے اور اس کا اسم ب ہے۔ ت ہجہ ہے۔ اور اس کا اسم ت ہے۔ اس طرح ہجوں کے نام ہیں۔

اگر لوحِ محفوظ میں ہجوں سے فقرے ترتیب دیئے گئے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ وہ سب کے سب اسمار ہیں۔ وہ ہجے بھی وہ کلمے بھی اسمار ہیں۔ وہ آیات بھی اسمار ہیں۔ سارے کا سارا مضمون اسمائے مرکب ہے اللہ تعالیٰ کا نام خود اسم ہے۔ اور اس کے بہت سے صفاتی نام ہیں۔ جو اسماءِ صفات کہلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ہر وہ چیز جو میری ذات و صفات کے بعد میرے حکم سے واقع ہو چکی ہے ان سب کا نام رکھ دیا گیا ہے اور ان سب کا علم حضرت آدم علیہ السّلام کو بخش دیا گیا۔ عدم اسم ہے۔ شہود اسم ہے غیب اسم ہے۔ جب یہ علم تقسیم کیا گیا۔ تو فرشتوں نے ان سے کچھ بات کی جب ان کو دُو بدُو کیا گیا اور فرمایا گیا۔ کہ وہی مضمون میں تمہارے سامنے رکھتا ہوں۔ جو آدم علیہ السّلام کے سامنے رکھا تھا۔ تم مجھے جواب دو! فرشتوں نے تعجب میں مبتلا ہو کر کہا۔ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا سب بزرگیاں تیرے لیے ہیں۔ ہم کچھ نہیں جانتے۔ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا۔ یہاں نفی علم نہیں کی گئی۔ بلکہ کہا گیا ہے کہ علم ہمارے پاس ہے مگر اتنا ہے جس قدر تو نے ہمیں عطا کیا ہے۔

اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ وہ علمِ کُل کا اختصاص خدا کیلئے کرتے ہیں۔ اور اس کا اقرار کرتے ہیں۔ کہ حضرت آدم صفی اللہ کو ہم سے زیادہ علم بخشا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ علوم عطا کیے

حضرت آدم علیہ السلام جو آخر الزماں خاتم النبیین حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلّم کی نبوت کی ایک جزو ہیں۔ اور اگر ایک جزو کو اللہ تعالےٰ اتنا علم دے سکتے ہیں۔ تو خاتم النبینؐ کے علم کے بارے کیا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ سارے نبی عطائی علم کے مالک تھے۔ یہاں نبوّت کے علم کا تذکرہ کرنا ضروری ہے۔ اگر آپ سورہ کہف پڑھیں۔ تو آپ کو ولائیت کے علم کی بھی خبر ہو جائے گی۔ نبوّت کے علم کے بعد ولائت کا علم ہے۔ انبیاءؑ کا علم بالوحی ہوتا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے یا خواہشاتِ نفسانی کے مطابق کوئی بات نہیں کہتے بلکہ وہی بات کہتے ہیں۔ جو پروردگارِ عالم اُن کو بتاتا ہے۔ ارشاد ہے

" وَمَا یَنطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوحٰی "

اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا نطق مبارک اور آپؐ کا ایک ایک لفظ سب کا سب اللہ کا ارشاد تھا۔ اور اُسے حدیث کہا جاتا ہے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زبانِ مبارک سے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ حدیثِ پاک ہے۔ اس واسطے حدیث سے انکار نہیں ہو سکتا. اور حدیثِ پاک قرآنِ مجید کو سمجھنے کا معیار ہے۔ اور اس کے بغیر قرآن

مجید کو سمجھا نہیں جا سکتا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے پہلے مفسّر ہیں۔ سُورتیں اُتر رہی تھیں۔ آیات نازل ہو رہی تھیں۔ لیکن آیات پاک کا ترجمہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ سب سے پہلے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اِن آیات کا ترجمہ فرمایا۔

جو لوگ حدیث کا انکار کرتے ہیں۔ وہ قولِ رسولؐ کے منکر ہیں۔ اگر آیات کا ترجمہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔ تو آخر صحابہؓ نے کس طرح انہیں سمجھا معلوم ہوا کہ سب سے پہلے مفسّرِ قرآن حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو ترجمہ بیان فرمایا تھا وہی حدیث شریف تھی۔ وہ کوئی اپنی مرضی سے نہیں کہتے تھے بلکہ وہی کہتے تھے۔ جو ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک مرتبہ علم کا دعویٰ کیا۔ حکم ہوتا ہے کہ بحرین کی طرف جائیے اور اپنے ساتھ مچھلی بھون کر رکھ لیجئے۔ اور اپنے بھائی کو بھی اپنے ساتھ لے لیجئے۔ آپ بھونی ہوئی مچھلی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ اور اس مقام پر پہنچتے ہیں۔ جہاں بتایا گیا تھا۔ وہاں ایک بندۂ خدا آپ کو ملتا ہے۔ یہ قرآن مجید کا مضمون ہے۔ جو نصِ قرآن ہے۔

شاید ترجمہ میں الفاظ آگے پیچھے ہو جائیں۔ لیکن مضمون بالکل وہی ہے۔ حکم ہوا تھا۔ کہ آپ جائیں وہاں ایک بندہ ملے گا۔ اس کے ساتھ بیٹھیں، مجلس کریں۔ چنانچہ آپ اس بندۂ خدا سے بحرین میں ملتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔ وہ جانتے تھے۔ کہ یہ نبیؑ وقت ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کہا کہ شاید آپ میرے ساتھ نہ رہ سکیں گے اور صبر نہ کر سکیں گے لیکن آپ نے وعدہ فرمایا کہ میں انشاء اللہ استقامت سے رہوں گا اور صبر کروں گا۔

چنانچہ آپ اُن کے ساتھ سفر پر روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک کشتی آئی۔ جس میں آپ نے شگاف کر دیا کشتی سامانِ سفر ہوتی ہے۔ شریعت میں حکم ہے کہ راستہ نہ توڑا جائے۔ کیوں کہ مسافروں کو تکلیف ہوتی ہے۔ جملہ شرائع میں راستہ بنانے کا حکم ہے۔ توڑنے کا حکم نہیں ہے۔ اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے پوچھا۔ کہ کشتی مسافروں کے لئے سامانِ سفر ہے۔ اس کو آپ نے کیوں توڑا؟ فرمایا:

"قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا" میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہ کر سکیں گے۔ آپ نے کہا انشاءاللہ آئندہ میں اپنا وعدہ پورا کروں گا۔ پھر آپ آگے گئے۔ راستے میں ایک نوجوان ملا آپ نے اس کو ایک طمانچہ مارا کہ وہ مر گیا۔ کسی بھی شریعت میں قتل جائز نہیں ہے۔ اللہ کے پاس جتنے نبیؑ آئے ان کی شریعتوں میں کہیں بھی یہ روا نہیں ہے۔ کہ کسی کو بلا وجہ قتل کریں۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السّلام نے شرعی طور پر احتساب کیا۔ یہ غیر شرعی احتساب نہیں تھا۔ شرعاً کسی شخص کو بلا وجہ قتل کرنا حرام ہے اے مردِ خدا! آپ نے کیوں اس بچے کو قتل کیا؟ آپ نے فرمایا: میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہ کر سکیں گے۔

آپ نے دوسری دفعہ وعدہ کیا۔ اور پھر آگے چل پڑے۔ انہیں ایک شکستہ دیوار نظر آئی۔ انہوں نے کہا کہ اے موسیٰ! آپ بھی پتھر لائیں اور میں بھی کوشش کرتا ہوں۔ ہم دونوں مل کر اس کی تعمیر کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے اس دیوار کو تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ آپ نے پھر اعتراض کیا۔ کہ بلا اجازت بلا معاوضہ اس دیوار کو کیوں تعمیر کر رہے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا۔

آپ نے تین دفعہ بہم و مسلسل مجھ پر اعتراضات کیئے اپنے وعدوں کی یاد دہانی پر آپ نے کہا کہ آپ مجھ پر تین دفعہ اعتراض کر چکے ہیں۔ لہٰذا میرے اور آپکے درمیان جدائی ہوگئی ۔ آپ جاتے ہوئے سنتے جائیں کہ میں نے یہ تینوں فعل کیوں کیئے۔ حالانکہ یہ کہنے والا نبی نہیں ولی تھا۔ حدیث میں آیا ہے۔ اور تمام علماء نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ خضر علیہ السّلام تھے۔ اور خضر علیہ السّلام ولی اللہ ہیں۔ ختم نبوت کے بعد کوئی ذی حیات انسان اس دُنیا میں نبی نہیں ہو سکتا۔ خضر علیہ السّلام تا قیامت زندہ رہنے والے ہیں۔ اس لیئے وہ نبی اللہ نہیں ہو سکتے بلکہ وہ ولی اللہ ہیں۔

پھر انہوں نے فرمایا کہ میں نے وہ کشتی اس لیئے توڑی تھی۔ کہ وہاں کا بادشاہ مسافروں کو اذیّت پہنچاتا تھا۔ اور اُن سے بیگار لیتا تھا۔ بچّے کے متعلق فرمایا کہ یہ ایک صالح باپ کا بیٹا تھا۔ اس کا باپ حاضر نہ تھا۔ اور یہ بچّہ آئندہ ایک بڑا مُشرک ہونیوالا تھا۔ میں نے اسے اس واسطے قتل کیا ہے کہ آئندہ اس سے شرک اور کُفر نہ پھیلے۔ حالانکہ شرک کے محض امکان سے کسی کو قتل کرنا شریعت میں جائز نہیں ہے۔

دیوار کے بارے میں فرمایا کہ یہ ایک یتیم کی میراث ہے۔ اور اس کے اندر خزانہ پوشیدہ تھا۔ جس کو میں نے دیکھا ہے۔ اس دیوار کو بلا اجازت و بلا معاوضہ تعمیر کرنیکی غرض یہ تھی۔ کہ اس یتیم کا مال محفوظ رہے۔ آج اگر کوئی شخص کسی ولی اللہ پر اعتراض کرے۔ کہ وہ علمِ غیب کی باتیں کیوں کرتا ہے۔ تو وہ عنداللہ حق بجانب نہ ہوگا جب کہ نبیٔ وقت کسی ولی اللہ کی غائبانہ بات پر اعتراض نہیں کرتا۔ بلکہ معترفانہ طور پر خاموش ہو جاتا ہے۔ حالانکہ نبیوں ؑ کو اجتناب کرنے کے بعد اپنے اجتناب کو توڑنے کا قطعاً حکم نہیں ہوتا

آج تک کسی نبیؑ نے احتساب کو نہیں توڑا۔ لیکن قرآنِ مجید سے ثابت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خضر علیہ السلام کے لئے اپنا احتساب توڑ دیا تھا۔ احتساب کے متعلق مزید وضاحت اس واقعہ سے ہوتی ہے۔ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ آپ کے پاس تین روٹیاں تھیں۔ راستے میں ایک روٹی کسی نے کھالی۔ آپ جانتے تھے۔ کہ کس نے کھائی ہے۔ لیکن آپ اس مقام پر علمِ غیب کی بات نہیں کرتے بلکہ دلائل سے کام لیتے ہیں۔ اور یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ کہ کس نے روٹی کھائی تھی۔ وہ خیال فرماتے ہیں کہ اگر اس چھوٹے سے جھوٹ کو میں نہ پکڑ سکا۔ تو بڑے بڑے احتساب کس طرح کروں گا۔ آپؑ نے یہاں معجزات پیش کئے اور جنگل کے درندوں کو پکار کر کہا کہ میں اللہ کا نبیؑ ہوں۔ میرے پاس آؤ۔ وہ آگئے تو آپؑ نے فرمایا۔ دیکھو ساتھیو! جنگل کے درندے بھی میرا حکم مانتے ہیں تم بھی میرا حکم مانو اور بتاؤ کہ وہ ایک روٹی کس نے کھائی ہے۔ ہم تین آدمی ہیں۔ یا میں نے کھائی ہے۔ یا تم میں سے کسی نے کھائی ہے۔ پھر بھی دونوں نے انکار کیا۔ انسان بضد ہو جائے تو خدا تعالےٰ ہی اس کو ہدایت دے سکتا ہے۔ پھر آگے چلے اور ایک دریا کو بغیر کشتی کے عبور کیا۔ اور کہا کہ دیکھو دریا بھی میرا احترام کرتا ہے۔ تم بھی خیال کرو۔ اور بتاؤ کہ روٹی کس نے کھائی ہے۔ ان کا جواب پھر بھی نفی میں تھا۔ اللہ نے ان کو الہام کیا۔ کہ یہ دنیادار ہیں۔ نفس پرست ہیں۔ لالچی اور حریص ہیں۔ ان کے سامنے کوئی ایسا معجزہ پیش کیجئے جو ان کے مطابق ہو۔ پھر آپ نے چند اینٹیں لیں۔ اور اُن پر اللہ کا نام پھونکا۔ سونا بن گئیں۔ اب آپؑ نے کہا کہ جس نے روٹی کھائی ہے اگر وہ اقرار کرے تو میں یہ اینٹیں اُسے دے دوں گا۔ جس شخص نے روٹی

کھائی تھی۔ اُس نے فوراً اقرار کر لیا۔ اور آپؑ کا احتساب پورا ہو گیا۔ جبکہ بالمعجزہ دلائل کے ساتھ منوانے کی پیہم اور مسلسل کوشش کی گئی۔ ادھر موسیٰ علیہ السّلام نے عین اُن مقامات پر جو شرعی رُو سے جرم قرار دیئے جا سکتے تھے احتساب کیا۔ کہ راستہ کیوں توڑا۔ بچے کو قتل کیوں کیا۔ اور دیوار بلا اجازت کیوں تعمیر کی۔

ہر چند کہ تینوں احتساب شرعی تھے۔ لیکن آپؑ نے جواب سُنا تو خاموش ہو گئے۔ اس واسطے فرمایا گیا ہے۔ کہ اولیائے عظام کے سامنے دلیل نہ پیش کیجئے۔ اور علمائے کرام کے سامنے حجت نہ کیجئے کہ اولیائے عظام جو علمِ باطن رکھتے ہیں۔ تم نہیں رکھتے اور علمائے جو علم رکھتے ہیں۔ وہ تم نہیں جانتے موسیٰ علیہ السّلام واپس آئے اور اپنی قوم کے سامنے اقرار کیا کہ اللہ کا علم بہت بڑا اور اتنا وسیع ہے۔ کہ اُسے کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ یہاں ایک اہم مسئلہ بیان کرنا ضروری ہے۔ کہ خضر علیہ السلام کسی طرح بھی نبوّت پر تفوّق نہیں رکھتے بلکہ اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل سے خود حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو مزید علم سے واقف کرانا چاہا۔ تو اس طرف بھیج دیا۔ نبیوں کو وحی کے ساتھ پابند کیا گیا ہے لیکن ولیوں پر وحی نہیں آتی۔ انہیں القا ہوتا ہے۔ الہام ہوتا ہے۔ سب نبیوں کے پاس خداداد علوم تھے۔ حضور نبیٔ آخرالزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اللہ کے بعد سب سے بڑے عالم ہیں۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ کے بعد سب سے بڑی ہستی جن پر غیب وشہود نزول کرتے رہے وہ نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی ذاتِ گرامی ہے۔ اس کے بعد انبیاؑ و اولیاء ہیں۔ اولیاء کشف بیان کرتے ہیں۔ کشف کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔ تمام علماء کے نزدیک کشف کے معنی بھی کھُلنے کے ہیں۔ اور سب اس پر بھی متفق ہیں۔

ترجمے کے معنی بھی کھلنے کے ہیں۔ اور تفسیر کے معنی بھی کھلنے کے بیان کئے جاتے ہیں۔ جبکہ ایک عالم، ایک مفکّر، اور ایک سائنس دان یا ایک حکیم ایک بوٹی کو دیکھتا ہے۔ تو کیا یہ بوٹی کہتی ہے۔ کہ میرے اندر ایسی خاصیت موجود ہے۔ آج تک ایسا نہیں ہوا۔ کہ کسی بوٹی نے حکیم سے خود بات کی ہو کہ میرے اندر ایسی خصوصیات موجود ہیں۔ حکیم کی فکر اس میں غور کرتی ہے۔ اُس کی آنکھیں دیکھتی ہیں۔ اور اُس کی بصیرت اس کو حل کرتی ہے۔ لیکن کوئی شخص آج تک یہ ثابت نہ کر سکا کہ بوٹی کے اندرونی خواص کو ظاہری آنکھ نے دیکھا ہو لفظ کو عالم کی آنکھ دیکھتی ہے۔ معنی کو اُس کی بصیرت دیکھتی ہے۔ اور سب اس بصیرت کے قائل ہیں۔ اور اس کا بھی سب کو علم ہے۔ کہ بصیرت کسی کی پیشانی پر نہیں ہوتی۔ بلکہ اندر ہوتی ہے۔ اب اگر اس پر اتفاق ہے۔ کہ آنکھ صورت کو اور بصیرت معنی کو دیکھتی ہے۔ تو کشف کا انکار کیسے ہو سکتا ہے۔ سارے عالم کشف کرتے ہیں۔ کوئی شخص ایسا نہیں ہے۔ جو کشف نہیں کرتا۔ جس نے زندگی میں کسی بات کا ترجمہ کیا ہو۔ گویا اس نے کشف کیا۔

بصارت آیت کو پڑھتی ہے۔ بصیرت آیت کا ترجمہ کرتی ہے۔ پھر ترجمے کا بھی ترجمہ اگر کیا جاتا ہے۔ تو اُس کو بھی بصارت نہیں بلکہ بصیرت ہی کرتی ہے۔ جب تشریح کی جاتی ہے۔ تو وہ بھی بصارت نہیں بلکہ بصیرت کرتی ہے۔

یہ ساری باتیں بصیرت سے نموّج لے کر ظاہر ہو سکتی ہے۔ تو تکشیف میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ اگر ایک عالم دین کے قلم سے ترجمہ کی صورت میں کشف ٹھیک ہو سکتا ہے۔ تو ایک ولی اللہ کی آنکھ سے کشف کیوں کر

ٹھیک نہیں ہو سکتا۔

ہاتھ جسم کے اوزار ہیں اور اس کا خارجی سامان ہیں۔ آنکھ جسم کا سب سے زیادہ لطیف ہاتھ ہے۔ یہ ثابت ہو چکا ہے۔ کہ مدرکات کے ساتھ آنکھ بھی تعلق رکھتی ہے۔ درک کرتی ہے۔ اور کسی چیز کو پکڑ کر اندر لے جاتی ہے۔ تو اس پر ایک نورانی ہاتھ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ سماع بھی عالم مدرکات سے کھیلتی ہے۔ اور باہر کی چیزوں کو اندر لے جاتی ہے۔ لہذا سمع بھی ایک ہاتھ ہے۔

اگرچہ اس ہاتھ کو دیکھا نہیں جا سکتا۔ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح قوت شامہ ایک ہاتھ ہے۔ جو ہر قسم کی خوشبو اندر لے جاتی ہے مگر نظر نہیں آتی۔ لامسہ بھی محسوس کی جاتی ہے۔ دیکھی نہیں کی جا سکتی۔ یہ سب ہاتھ ہیں قوائے ظاہریہ کی طرح جستجو کرتے ہیں۔ چیزوں کو محسوس کرتے ہیں۔ اور اندر لے جاتے ہیں۔ اس واسطے آنکھ ایک ہاتھ ہے مگر لطیف۔

اگر ارادت ہاتھوں سے ٹپک کر مضمون بن سکتی ہے۔ اگر ارادت ہاتھوں سے ٹپک کر طیارہ بنتی اور ہوا میں اڑ سکتی ہے۔ اگر ارادت انسانی ہاتھوں سے ٹپک کر جواہری توانائی بن سکتی ہے۔ تو کیا ایک ولی اللہ کا تصور ایک ولی اللہ کی تمنا، کشف بن کر آنکھوں سے باہر نہیں آ سکتی؟ اس سے کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے۔ اس سے انکار کرنا فطرت کے اصولوں سے انکار کرنا ہو گا۔ اگر خدا علم نہ دیتا۔ تو معلومات کے متعلق حکم دینا بے فائدہ ہوتا علم معلومات سے تعلق رکھتا ہے معلومات ۲ دو قسم کی ہوتی ہے۔ صوری اور معنوی۔ اللہ کا منشار در حقیقت معنویت تک پہنچانا ہے۔ اسے حقیقی معنی تک جن سے تمام معانی نکلتے ہیں۔ اس واسطے اللہ تعالےٰ نے صور ہائے مختلفہ

کو آنکھوں کے سامنے بکھیر دیا ہے۔ اور معانی کی طرف دوڑنے کیلئے بصیرت عطا فرمائی۔ کشف مومنوں کے گھر کی ایک لونڈی ہے۔ لیکن بعد کے لوگوں نے اسے ایک اجنبی چیز بنا دیا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب کو استخارہ کرنیکا حکم دیا کرتے تھے۔ آپؐ کے حضور میں ایک عورت آتی ہے۔ اور عرض کرتی ہے کہ میری سب اولاد مرچکی ہے۔ ایک بیٹی تھی وہ بھی فوت ہو چکی ہے۔ فرمایا جاؤ استخارہ کرو۔ رات کو خواب میں ملے گی۔ اس نے استخارہ کیا۔ اور لڑکی کو ایک جنگل میں دیکھا۔ کہ اس جنگل کو آگ لگی ہوئی ہے۔ اور آگ کے شعلے بچی کے مختلف اعضاء کو کھا رہے ہیں۔ اس کے ہاتھوں، پاؤں، کانوں آنکھوں اور ہونٹوں کو کھا رہے ہیں۔ صبح کو پھر خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی، کہ بچی کو میں نے ایسے عذاب میں دیکھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس کے خاوند کو بلاؤ۔ شاید اس نے اپنے خاوند کی حق تلفی کی ہو۔ اس کا خاوند آیا۔ آپؐ نے پوچھا تو عرض کیا۔

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں اپنی بیوی سے بے حد راضی ہوں فرمایا۔ اس کے وہ گناہ بھی معاف کرو۔ جن کا تمہیں علم نہیں ہے۔ اس نے کہا میں نے معاف کیا۔ آپؐ نے اس عورت سے فرمایا۔ پھر استخارہ کرو۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ وہ جنت الفردوس میں موجود ہے۔ وہ اپنی بیٹی سے ملنا چاہتی ہے۔ لیکن وہ منہ پھیر لیتی ہے۔ آخر وہ بیٹی سے شکایت کرتی ہے کہ میں تیری ماں ہوں مجھ سے ملو اور بات کرو کہ کیا وجہ ہے کہ تم مجھ سے روٹھی ہو۔ اس نے جواب دیا۔

کہ تم ماں ہونیکی حقدار نہیں ہو۔ تم ظالم اور ناانصاف ہو۔ ایک فانی

اور مستعار دنیا میں تم نے مجھ سے اس قدر لاڈ پیار کیا۔ لیکن خدا کے بارے کچھ نہیں بتایا۔ کبھی تم نے یہ نہیں کہا کہ نماز نہ پڑھنے والوں سے اللہ بے حد ناراض ہوتا ہے۔ اور غضب کی سزا بیان کرتا ہے۔ میں نے اپنے خاوند کی حق تلفیاں تیرے سامنے کیں۔ لیکن تو نے نہ سمجھایا اور فلاں فلاں گناہ کیے لیکن تو نے نہ بتایا۔ اس واسطے تو میری ماں نہیں میری دشمن ہے۔ ماں تو وہ ہو نیکی حق دار ہے۔ جو اللہ کے خوف سے ڈرائے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم چھوٹی چھوٹی باتوں تک کا حکم دیتے تھے کہ ان کیلئے استخارہ کرو۔ احادیث میں استخارے کے متعلق بالوضاحت بیان آیا ہے

حضرت یوسف علیہ السّلام کے زمانے میں عزیز مصر نے جو غیر مسلم تھا۔ ایک خواب دیکھا تھا قرآن شریف اس خواب کو بیان فرماتا ہے۔ اگر خواب اتنی سنجیدہ چیز ہے۔ اور ایک غیر مسلم ایک نبی اللہ سے اپنے خواب کی تعبیر وصول کرتا ہے۔ اور وہ تعبیر ٹھیک نکلتی ہے تو کیا ایک کلمہ شریف پڑھنے والا سچے خواب نہیں دیکھ سکتا۔ اسی لئے باوضو سونے کا حکم ہے۔

باوضو سونے والے، بے وضو سونے والوں سے بہتر ہیں۔ اچھے اور نیک ہیں۔ نیکی اختیار کرو۔ خدا اور اس کے رسول کا خوف اپنے دل میں رکھو۔ تحقیق کرو، مسلمان محقق ہے۔ مبحث نہیں ہے۔ بے جا بحث میں زندگی برباد کرنیوالا نہیں ہے بلکہ وہ تحقیق کرتا ہے۔ اور جب تک کسی بات کی تحقیق نہ کر لے اس پر بحث نہیں کرتا۔ اور اگر بحث کرے تو اسکا مقصد کسی حقیقت تک پہنچنا ہوتا ہے۔ بعد کے مسلمانوں نے اپنے آپ کو بے جا بحث میں مبتلا کر کے تحقیق کرنا چھوڑ دیا ہے۔

مسلمانوں کا ایمان ہے کہ اسلام روحانی مذہب نہ ہوتا تو وہ غیر مقبول

ہوتا۔ اسلام ہی ایک ایسا رُوحانی مذہب ہے۔ جو رُوح سے ابتداء کر کے مادّے پر مُسلّط ہوتا ہے۔ اور دونوں جہانوں کو مسخّر کر لیتا ہے۔

قرآن مجید اور قضا و قدر

"قانونِ فطرت" نیکی اور بدی کرنے میں کسی کا ہاتھ نہیں روکتا۔ البتہ نیکی کی جزا اور بدی کی سزا دیتا ہے۔ انسان کو یہ گلہ نہیں کرنا چاہیئے کہ قسمت نہیں بدل سکتی۔ بلکہ نیک ہو کر اللہ کی تائید سے قسمت کو بدل لینا چاہیئے۔ جس سے ایک جہان کی قسمت بدل سکتی ہے۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝

اس آیت کریمہ سے پہلے تمہیداً کچھ تحریر کرنا ضروری ہے لوگوں کو جاننا چاہیئے کہ یہ سارا عالم موجودات، یہ ساری کائنات اور اس میں جو کچھ بھی ہے وہ لوح محفوظ میں موجود ہے۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ تمام اشیاء عالمین لوح محفوظ سے پہلے بھی خداوند ذوالجلال کے علم میں موجود تھیں جو آئندہ وجود میں آئیں گی۔ وہ بھی اللہ پاک کے علم میں موجود ہیں۔

اسلامی تعلیمات میں لوح محفوظ ایک کتاب ہے جس میں اللہ تعالےٰ نے اپنی مخلوقات کا ذکر فرمایا ہے، ان کی پیدائش و مرگ، ان کے مختلف حالات، ان کے تغیرات اور ان کے ازل سے لیکر ابد تک کی کیفیات نہایت شرح و بسط سے درج فرمائی ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے ہر چیز کو پہلے اپنے علم، اپنی قدرت، اور اپنے فیصلے سے پیدا فرمایا اور اپنی ہی مرضی سے انہیں خصوصیات بخشی ہیں کوئی چیز اس کے حکم اور مرضی کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی اور نہ حرکت کر سکتی ہے۔ یہاں تک کہ :۔

"لَا يَتَحَرَّكُ ذَرَّةٌ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ تَعَالٰى"

ایک ذرّہ بھی اللہ کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا فرمایا :۔

"مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ"

"یعنی تم کچھ بھی پسند نہیں کر سکتے جب تک اللہ اسے پسند نہ کرے"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں جو گناہ ہوتے ہیں اور خطائیں سرزد ہوتی ہیں۔ کیا وہ گناہ گردانے جا سکتے ہیں؟ اکثر اس پر بحث ہوتی رہتی ہے اور زیادہ تر اہلِ عقل اس مسئلہ میں الجھے ہوئے ہیں۔ بالخصوص دورِ حاضرہ کے

لوگ اس مصیبت میں مبتلا ہیں۔ غالباً ان کے سامنے اس مسئلے کا صحیح حل نہیں پیش کیا گیا۔ اس واسطے ان کا شک موجود رہتا ہے۔ خدا کرے اس مضمون میں اس کا صحیح حل پیش کیا جا سکے۔

اہل اللہ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو سب سے پہلے تخلیق فرمایا تھا وہ احساس تھا۔ اہل اللہ نے یہ فیصلہ شریعت کی روشنی میں فرمایا ہے۔ یعنی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے احساس تخلیق فرمایا وہ احساس ارواح تھیں۔ ارواح سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضور فخر دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے نور کو پیدا فرمایا۔ یہ نظام تخلیق کا نقطۂ آغاز تھا اور یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ ازل کے دن اللہ تعالیٰ نے جن احساسات کو خطاب فرمایا وہ روحیں تھیں۔ وہاں انبیاء صلحاء شہداء اور عامۃ الناس کی ارواح موجود تھیں۔

اہل اللہ نے فرمایا کہ تمام روحیں احساسات کے ساتھ موجود تھیں اور ادراک رکھنے والی اور فہم رسا رکھنے والی تھیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے روحوں کو استفہام کے ساتھ خطاب فرمایا۔ "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ جیسے کوئی یوں کہے کہ آپ فلاں طرف سے نہیں آئے۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ آپ یقیناً اس طرف سے ہی آئے ہیں اور آپ کو اس کا علم ہے اس لئے آپ سے پوچھا جا رہا ہے کہ آپ اس طرف سے آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسی استفہام سے کام لیتے ہوئے فرمایا ہے "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" اس کلام الٰہی سے معلوم ہوا کہ فہم پہلے سے موجود تھا۔ اگر فہم اور شعور موجود نہ ہوتے تو استفہام غیر ضروری ہوتا۔ "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں" یعنی تم جانتے ہو، کہ میں تمہارا رب ہوں۔ اور تم کو اس کا علم ہے۔ سب روحوں نے جواب دیا "بَلٰی" ہاں تو ہمارا رب ہے۔ اگر پہلے احساس نہ ہوتا اور امر الٰہی نازل ہو جاتا، تو ایسی حالت میں کوئی مکلف نہ ہوتا۔ پہلے احساس کی زمین کو پیدا فرمایا۔ اس کے بعد

امر الٰہی صادر ہوا۔ تم تکلف میں مبتلا کر دیئے گئے ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنا فیصلہ تھا اس نے اپنی مرضی سے مخلوق کو پیدا فرمایا۔ کسی عقل و فراست یا علم و ہنر کا اس میں کوئی دخل نہ تھا۔ اس نے اپنی مرضی سے مخلوقات کو پیدا فرما کر اس کو نفع اور ضرر کا احساس بخشا اس کے بعد امرِ الٰہی صادر ہوا۔

اس واقعہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے علم سے فرشتوں، جنوں اور انسانوں کی روحوں کو جسمانی اشتراک کے ساتھ پیدا فرمایا اور عقل و شعور کی نعمت کے ساتھ انہیں جاری و ساری کر دیا۔ اس کے بعد بعثتِ نبوت کے ساتھ ذوی العقول انسانوں اور جنوں کو اپنے اوامر و نواہی صادر فرماتا رہا۔ اس بنا پر ذوی العقول مکلف قرار دیئے گئے

یہ خاص بات ہے کہ اللہ کے جملہ اوامر و نواہی سب کے سب ہمارے نفع کے لئے ہیں۔ نقصان کے لئے نہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک جس قدر اوامر سماویہ نازل ہوئے وہ من حیث المجموع انسانی فلاح و بہبود کے لئے تھے۔ اللہ کے اوامر مضرات سے پاک ہیں۔ جن امور میں ہمیں مکلف کیا گیا۔ ان میں دین و دنیا کے مفادات مضمر ہیں اور جن امور سے منع فرمایا گیا ہے ان کو چھوڑنے میں بھی ہمارا ہی فائدہ ہے۔

احساس و شعور اور اوامر و نواہی ہمارے ہی منافع کے لئے ہم کو دیئے گئے ہیں ہم میں کوئی ایسا انسان نہیں ہے جس کے ہاتھ میں زہر دیا جائے اور وہ اس کو زہر جانتے ہوئے کھالے۔ سوائے اس گستاخ کے جو خودکشی کرنا چاہتا ہو۔ اس کے علاوہ کوئی باشعور انسان ایسا نہیں ہے جو دانستہ اپنے آپ کو خلاف حکم الٰہی ہلاکت میں ڈالے۔ بلکہ کوئی مفکرِ حق بھی اس فطری حکم خداوندی کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔

صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک سب انسان اپنے منافع کے لئے

دوڑتے نظر آتے ہیں اور اپنے علم و فن اور محنت و عقل کو اسی لیئے خرچ کرتے ہیں ان میں چھوٹے بڑے، امیر و غریب، عالم و جاہل کی تخصیص نہیں ہے۔ برخلاف اس کے جہاں نقصان کا اندیشہ ہو اس طرف قدم نہیں اٹھاتے اس سے معلوم ہوا کہ انسان قطعی نفع چاہتا ہے اور کسی حالت میں نقصان نہیں چاہتا اور مہلکات سے ہمیشہ اجتناب کرتا ہے۔

جب انسان کے اندر اس درجہ شعور موجود ہے کہ وہ سود و زیاں میں تمیز کر سکتا ہے تو پھر وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار بھی ہوگا۔ بالخصوص ایسی صورت میں کہ اس کو احساس و شعور دے کر چھوڑ نہیں دیا گیا۔ اس کی تعلیم و ہدایت کے لیئے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات مسلسل بھیجے جاتے رہے۔ صحائف آسمانی اترتے رہے، اور آیات نازل ہوتی رہیں۔ نفع و ضرر کی تمیز کرائی جاتی رہی۔ چنانچہ فرمایا :-

"مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ؕ"

جس شخص نے احساس اور شعور کی موجودگی میں اللہ اور اس کے رسولوں کو تسلیم کیا اور ان کی اطاعت کی وہی عظیم کامیابی تک پہنچا۔ اس کے خلاف جانے والے صریح گمراہی اور خسارہ میں ہیں۔ درحقیقت ان کی دنیاوی ترقیاں اور کامیابیاں بھی ان کے لیئے سود مند نہ ہوں گی۔

قضا و قدر کے بارے میں قرآن حکیم میں اور بیسیوں کے علاوہ ایک آیۃ کریمہ یہ بھی ہے۔

"يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ"

ہر مسجد میں ہر منبر پر اس کی یہی تفسیر ہوتی ہے کہ اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے اکثر لوگ اس کی پوری تفسیر بیان نہیں کرتے یہ اہل اللہ ہی کا کام ہے کہ اسکی پوری پوری تفسیر کریں۔ اس واسطے کہ عقل پر انحصار کرنیوالے

بھٹک سکتے ہیں۔

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کی مشیت میں اگر کوئی گناہ کرے تو کیا وہ اس کا ذمہ دار ہے؟ کیا اس کی نیکیوں اور بدیوں کی اسکو جزا و سزا ملے گی؟ کیا اللہ تعالے کسی کو گناہوں سے روک سکتا ہے؟ درحقیقت یُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِیْ مَنْ يَّشَآءُ میں يَشَآءُ کی قید رکھی گئی ہے۔ یعنی اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اس مقام پر یہ امر بھی غور طلب ہے کہ کیا اللہ تعالے گناہ کو پسند کرتا ہے؟ سارے قرآن کریم اور احادیث قدسیہ میں کہیں بھی یہ فیصلہ نہیں ملتا کہ اللہ تعالے گناہ کو پسند کرتا ہے۔ تمام آسمانی کتابوں میں یہی لکھا ہے کہ اللہ تعالے نیکی کو پسند کرتا ہے اور اسی کے کرنے کا حکم فرماتا ہے اور برائی سے منع فرماتا ہے اور شیطان جو نیکی کی ضد ہے۔ برائی کی دعوت دیتا ہے، ارشاد باری تعالے ہے۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً ط

یعنی شیطان تم کو ذلت اور گمراہی کا راستہ بتاتا ہے اور فسق و فجور میں مبتلا کرتا ہے اور ہلاکتوں کی طرف ہانکتا ہے اور خداوند ذوالجلال تمہیں مغفرت کی دعوت دیتا ہے جس میں خود تمہاری عافیت ہے۔

یہاں قید "یشاء" سے معلوم ہوا ہے کہ اللہ صرف نیکیوں کو پسند کرتا ہے ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ نیکیوں کو ہی پسند کرتا ہے تو پھر لوگ کیوں گمراہ ہوتے ہیں۔ سورۃ بقرہ میں منافقین کے ذکر میں فرمایا۔

وَيَمُدُّهُمْ فِىْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ہ

یعنی ان کو اللہ اُن کی گمراہی میں دھکیل دیتا ہے ایسے کہ اندھوں اور

فریبیوں کے ساتھ اللہ کیا کرتے ہیں۔ ان کو ان کے گناہوں اور سرکشیوں میں جھونک دیا جاتا ہے اور یہی ان کی سزا ہے۔ اللہ یہ چاہتا ہے کہ جو جس چیز کو پسند کرتے وہ اسے ملے پہلے تو وہ گناہ سے منع فرماتا ہے اس کے سارے رسولؑ گناہ سے منع کرتے ہیں اس پر بلائیں نازل کئے جاتے ہیں۔ زلزلے ڈالے جاتے ہیں طوفان اور آندھیاں چلائی جاتی ہیں۔ بلائیں اور وبائیں بھیجی جاتی ہیں۔ اگر گناہ گار اس سے باز نہ آئیں تو ان کو ہلاکت میں ڈال دیا جاتا ہے۔

تاریخ انسانیت میں ایسے لوگوں کے لیے شمار عبرتناک واقعات موجود ہیں۔ چنانچہ فرعون کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس کو ساری زندگی دردِ سر نہ ہوا۔ اللہ کو یہ منظور نہ تھا۔ کہ وہ دردِ سر مجبور ہو کر اللہ کو پکار بیٹھے۔ اس واسطے کہ اللہ تعالےٰ اس سے ناراض تھا۔ اور یہی اس کی سزا تھی کہ اس کو اس کی فرعونیت ہی میں تباہ کر دیا جائے۔ اس کی سرکشی خود اس کی تباہی کا سامان بن گئی۔

قانون فطرت یہ ہے کہ جو گناہوں کو پسند کرتے ہیں ان کو اسی میں مبتلا رکھا جاتا ہے اور جو نیکیوں کو پسند کرتے ہیں ان کو نیکیوں کی توفیق دی جاتی ہے۔ ارشاد باری تعالےٰ ہے۔

"اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ط"

یعنی ایمان لانے کے بعد اسی ایمان کے اندر جو زندگی بسر کرتے ہیں اللہ تعالےٰ ایسوں کو اپنا دوست رکھتا ہے ان پر اپنے اسرار و رموز منکشف فرماتا ہے۔ اس دوستی کے نتیجہ میں لوگوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہدایت کا سمجھنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ ہدایت اپنے اندر بڑا عمق رکھتی ہے جو انسان پر فوراً واضح نہیں ہو سکتی مگر جن کو اللہ تعالےٰ اپنا دوست رکھتا ہے ان پر اپنے اسرار و بھید آہستہ آہستہ منکشف فرماتا ہے۔

"يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ"

کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ جہالت کی تاریکیوں، کفر و شرک اور بدعت کی ظلمتوں سے نکال کر وہ نور اسلام کی طرف لے جاتا ہے ہدایت کے راستے ان پر واضح ہوتے ہیں اور عقدہ ہائے لاینحل ان پر کھلنے لگتے ہیں ان کے لئے اسباب پیدا کر دیئے جاتے ہیں۔ کسی بندۂ خدا کو ان کے پاس بھیج دیا جاتا ہے۔ کوئی مفسّر، کوئی مفکّر، کوئی معلّم ان کو مل جاتا ہے اور وہ ہدایت پا جاتے ہیں۔ بہر حال اللہ کی تائید ان کے شاملِ حال ہوتی ہے۔

برخلاف اس کے جو لوگ منکر ہیں۔ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اللہ ان کو سزا دیتا ہے وہ اسی زمین پر بستے اور روزی کماتے ہیں۔ شمس و قمر ان پر طلوع ہوتے رہتے ہیں۔ زندگانی کے سارے فوائد و منافع وہ حاصل کرتے رہتے ہیں۔ اللہ ان کو یہ سزا دیتے ہیں کہ ان کو اپنی دوستی سے محروم کر دیتے ہیں کیونکہ وہ رب العالمین ہے اور اس نے سب کو روزی دینے کا وعدہ فرمایا ہے وہ سب کو پالنے والا ہے اس لئے پروردگار عالم اپنے دسترخوانِ ربوبیت سے کسی کو نہیں اٹھاتا ان کو ساز و سامانِ زندگی اہل و عیال، قصر و ایوان، دنیاوی جاہ و جلال تک بھی دیئے جاتے ہیں لیکن اللہ ان کی بداعمالیوں پر بدستور ناراض رہتا ہے

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔــهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ

جو لوگ منکر خدا ہیں ان کے دوست شیطان ہیں جس کے نتیجے میں ان کی عقلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں قابلِ فہم بات بھی سمجھ نہیں سکتے اور حق سے ضد کرنے لگتے ہیں اپنی کج روی کو منطقی دلائل سے ثابت کرتے ہیں حالانکہ وہ ہمیشہ حق و صداقت سے دور رہتے ہیں۔ انبیائے کرام نے ان کی تفہیم کے لئے عقلی دلائل اور خرقِ عادات یعنی معجزات پیش کئے لیکن جو ضدی تھے وہ ضد پر قائم رہتے ہے۔

ایک دفعہ ضد میں آکر ابوجہل نے اپنے رفقاء سے منصوبہ بنایا کہ ایک بڑے حکیم سے برسرِ مجلس کہلوایا جائے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم العیاذ باللہ مراقی یعنی مجنون ہیں۔ اور وہ جو باتیں کرتے ہیں صحیح نہیں ہیں، اس لئے ان کو نبی نہ تسلیم کیا جائے۔ چنانچہ اکابر جمع ہوئے اور ایک یہودی حکیم کو دعوت دی گئی۔ ابوجہل اپنے رفقاء سے سازش تیار کرتا ہے اور اس مجلس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دعوت دی جاتی ہے۔

ابوجہل اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے کہ کوئی بھی آپ کی تعظیم کے لئے نہ اٹھے چنانچہ آپ تشریف لائے تو تائید ایزدی اور اعجاز نبوت سے مجبور ہو کر تمام مجلس غیر ارادی طور پر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس مجلس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کئے گئے۔ آپ نے ایسے معقول اور مدلل جواب ارشاد فرمائے کہ ساری مجلس مبہوت ہو گئی۔ بے بس ہو کر اس یہودی حکیم نے کہا کہ آپ ہمیں ایک معجزہ دکھائیں کہ چاند آسمان پر دو ٹکڑے ہو جائے۔ تب میں آپ کو اللہ کا نبی تسلیم کروں گا اور اسلام قبول کروں گا۔ تب آپ نے اللہ کے حضور یہ دعا فرمائی۔

"اے اللہ میں تیرا ہی فرستادہ ہوں اور تیری ہی طرف سے لوگوں کو دعوت دیتا ہوں۔ یہ لوگ مجھ سے معجزہ طلب کرتے ہیں۔ تیری قدرت کا یہ ادنیٰ سا کرشمہ ہے کہ چاند دو ٹکڑے ہو جائے۔"

چنانچہ آپ نے اس دعا کے بعد اپنی انگشت سے اشارہ فرمایا جس سے چاند دو ٹکڑے ہو گیا لیکن اس اعجازِ شق القمر کے بعد بھی منکرین نے کہا کہ یہ جادو ہے۔ اللہ نے ایسے ہی لوگوں کے لئے فرمایا:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ط وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ط

یعنی وہ منکرین جنہوں نے دیدہ دانستہ حق سے منہ پھیرا۔ آپ کا ان کو ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے۔ وہ ایمان نہیں لاتے۔ وہ جان بوجھ کر ضد کرتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو قائل نہیں کر سکتے تھے بلکہ اس عالم الغیب نے جس کے علم میں ان لوگوں کی بداعمالیاں اور ان کا انجام ہے اُن کو مختوم فرما دیا ہے کیونکہ ایسے اعمال کا یہی نتیجہ ہونا تھا۔ اب وہ اپنے ہی اعمال کے نتیجے میں مختوم ہو گئے ہیں۔ ایسے دانستہ انکار کرنے والوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں پر سمع و بصر پر ناراضگی کی مہر لگادی ہے اور ان پر حجاب طاری کر دیا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں معجزہ کے یہ معنی ہیں کہ کسی چیز کی ذات کو اس طرح بدل دیا جائے کہ اس پر عقل انسانی احاطہ نہ کر سکے اور عقل عاجز و حیران ہو کر اسے قبول کرنے پر مجبور ہو جائے۔ مثلاً سنگ ریزوں کو قوت گویائی بخشنا، چاند کو شق کر دینا، سورج کو واپس لوٹا دینا، دریاؤں کا بول اٹھنا، مردوں کو زندہ کر دینا، اعجاز نبوّت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ وہ ذاتِ کفر کو اسلام سے بدل دیتا ہے نبیوں کے معجزات اگر بہت کچھ بدل سکتے ہیں تو کیا وہ مختوم ازل کی مہر نہیں توڑ سکتے؟ یقیناً توڑ سکتے ہیں مگر اللہ و رسول اس بات کو پسند نہیں فرماتے کہ ایسے سرکشوں کو جو سرکشی پر تلے ہوئے ہوں معاف فرمایا جائے۔ یہی ناراضگی ان کو ہدایت پر نہیں آنے دیتی اور وہ گمراہی میں پڑے بھٹکتے ہیں، یہی ان کی سزا بن جاتی ہے۔

اگر علم و شعور کی موجودگی میں کوئی اللہ تعالیٰ سے باغی ہو جائے تو وہ راندہ درگاہ ہو جاتا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی یہ صفت ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو پالتے ہیں اور اپنی بے شمار نعمتوں سے سرفراز فرماتے ہیں اور اپنی آیات اُن کے

سامنے پیش کرتے ہیں۔

احساس و محسوسات، علم و معلومات سب کے سب آیاتِ الٰہیہ ہیں ان سے انسان استفادہ کر سکتا ہے مگر ان کو وجود میں نہیں لا سکتا۔ مصنوعات صفاتِ عقلیہ میں داخل ہیں لیکن نظامِ تخلیق اور ذاتِ مادہ انسانی دستِ بُرد سے آزاد ہے اور وسعتِ فکرِ انسانی صرف اپنے حیطۂ امکان تک ہی گزر سکتی ہے، موجودات کا ہونا اس بات کی علامت ہے کہ کوئی عقل اس تک پہنچے یا رسائی حاصل کرے۔

مخاطب انسان کو چاہیئے کہ آیاتِ الٰہیہ جو دعوت دیتی ہیں، اپنے افکار کے ساتھ بر سبیل معلومات قبول بہ دل و جان کر کے اس کی مکمل تعمیل کرے اور اس طرح اس مقصودِ حقیقی تک پہنچے جو منتہائے تخلیق ہے۔ یہی صراطِ مستقیم ہے۔ ان ہی آیات کو سمجھانے کے لئے بار بار انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات مبعوث ہوتے رہے، اور تعلیماتِ الٰہیہ دسترخوانِ انسانیت پر پیش کرتے رہے۔ یہ اسبابِ انسانی ہدایت کے لئے مہیا کئے گئے، ارشاد فرمایا:۔

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ

یعنی ہم نے ان کو دکھانے کے لئے آفاقِ عالم میں اپنی لاتعداد آیات پیدا کر دی ہیں اور ان کے وجودوں میں بھی آیات پیدا کر دی ہیں تاکہ ان پر حقائق واضح ہو جائیں یہ ایسی اچھوتی آیات ہیں جو دستِ بُردِ انسانی سے آزاد ہیں اور ہمیشہ آزاد رہیں گی کیونکہ عقل و معقولات ادراکِ انسان کے لئے ہیں۔

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا

بے شک ہم نے انسان کے لئے دو راستے بنائے ہیں۔ ایک فرمانبرداری کا، ایک نافرمانی کا۔ یعنی اطاعت میں تمہاری نجات ہے اور نافرمانی میں ہلاکت تم کو شعور کے ساتھ ہدایت کے راستے بتائے گئے ہیں ان میں تمیز کرنا اور ہدایت

پانا تمہارا کام ہے۔

مگر بر خلاف اس کے لوگ خود اپنے نفس کے لئے نفع اور ضرر کی راہیں ڈھونڈتے ہیں اور اللہ کے بتائے ہوئے نیک و بد میں تمیز نہیں کرتے۔ یہ بڑے ظلم کی بات ہے معلوم ہوا کہ قضا و قدر تمہارے لئے ہیں۔ تم قضا و قدر کے لئے نہیں بلکہ تم خود اپنے لئے افتاد پیدا کرتے ہو جو سزا و جزا کا باعث بن جاتی ہیں۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ یہاں یہ گمان پیدا کرنا کہ وہ اپنے کسی فیصلے کو نہیں بدل سکتا۔ اللہ کی ذات کو عاجز گردانتا ہے اور ذات باری تعالیٰ ایسے نقائص سے منزّہ ہے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ ارشاد فرمایا

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ

یعنی اللہ تعالےٰ جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ اپنے فیصلے اپنے علم و حکمت سے بدل سکتا ہے اور بدلتے ہوئے فیصلے بھی اس کا علم قدیم ہیں۔ ایک اور مقام پر صالحین کی شکر گزاری باعثِ ایزادِ رحمت بتائی گئی جو مالِ مقسومہ پر مستزاد ہے۔ فرمایا:۔

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ ط

"اگر تم انعامات خداوندی کا شکر ادا کرو گے تو ہم تم کو بہت زیادہ دیں گے"

یہاں شکرانہ ماحضر کا بیان فرمایا، اور ہر مالِ ماحضر مالِ مقسومہ ہوتا ہے۔ صحیح ترجمہ یہ ہو گا کہ اگر مالِ مقسومہ کا شکر ادا کرو گے تو ہم تم کو تمہاری قسمت سے زیادہ دیں گے اور شکرانہ اہل ایمان کا ہوتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ مومن کی شکر گزاری تقدیر کو بدل سکتی ہے یہ مقام سعادت ہے اس واسطے مومن جہاں کہیں ہو اس کی سعادتوں سے قسمتیں بدل جاتی ہیں وہ جس طرف توجہ کرتا ہے انقلاب آجاتے ہیں اور یہی مومن کی خرقِ عادت ہے جتنی کہ وہ نیکیوں

کے ساتھ مقرب خدا بن جاتا ہے۔

یہ ارتقائی منازل کی باتیں ہیں جن کو انسان اپنی صلاحیتوں سے پا سکتا ہے بخلاف اس کے جب وہ اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے خدا کی عطا کردہ رفعتوں سے گرنا شروع ہو جاتا ہے تو وہ جہالت کی پستیوں میں کھو کر گمراہ ہو جاتا ہے اس گمراہی کو وہ حقیقت زندگی تصور کرتا ہے اور اپنی نفسانی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اسی پر زندگی تعمیر کرتا ہے۔ درحقیقت وہ اتباع نفس کرتا ہے کہ وہ اسے دنیا کے اوج ثریا تک پہنچا دے۔ دنیا کی دقیق ترین گتھیوں کو اپنے ناخن تدبیر سے کھولتا ہے۔ طاغوتی طاقتیں اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی ہو جاتی ہیں اور وہ خشکی، تری اور فضا و خلاء کی قوتوں کو تسخیر کر لیتا ہے۔

لیکن یہ ارتقاء اپنے لئے تباہی و غارت گری، بے انصافی، ظلم و ستم اور عدوان لاتا ہے اور کائنات کی پریشانی، بلکہ ہلاکت کا باعث ہوتا ہے کیونکہ اس عروج خاکی میں نیکی کا خمیر شامل نہیں ہوتا، رضائے الٰہی شامل نہیں ہوتی، پس معلوم ہوا کہ خالق فطرت صرف نیکی چاہتا ہے اور اس کی تائید فرماتا ہے۔

قانون فطرت نیکی اور بدی کرنے میں کسی کا ہاتھ نہیں روکتا البتہ نیکی کی جزا اور بدی کی سزا دیتا ہے۔ انسان کو یہ گلہ نہیں کرنا چاہئیے کہ قسمت نہیں بدل سکتی بلکہ نیک ہو کر اللہ کی تائید سے قسمت کو بدلنا چاہیے جس سے ایک جہان کی قسمت بدل سکتی ہے۔

خالق ارض و سما نے انسان کے اندر یہ توفیقات ودیعت فرما دی ہیں شعور دے کر اس کے سامنے بلندیاں اور پستیاں رکھ دی ہیں۔ اب یہ اس کے اختیار میں ہے کہ جس طرف چاہے چلا جائے لیکن اللہ تعالےٰ کی منشاء یعنی پسند اور خوشنودی اس میں ہے کہ انسان بلندیوں کی جانب چلے تو ان میں عین رضائے حق اور منشائے الٰہی کو مقصود منزل جان کر نجات پالے اور تقرب حق سے سرفراز ہو۔

قرآن مجید کی انقلاب انگیزی

قرآنِ مجید کی جملہ تعلیمات صاحبِ ایمان کو
ایمان سے ابتدا کرنیکی اس واسطے تاکید کرتی ہیں
کہ جسمِ ثقیل کے ذرّے ذرّے پر صرف روحانیت
ہی کارفرما ہے ورنہ وہ بیکار مُردہ کی حیثیت
رکھتا ہے اسکی جُملہ حرکات و سکنات رُوح پر
مرتب ہوتی ہیں

قرآنِ مجید اپنے حرفِ اوّل سے لیکر حرفِ آخر تک ایک اعجازِ عظیم ہے قرآنِ مجید کا انقلاب انگیز نزول عالم فطرت میں ایک ایسے عظیم معجزے کی صورت میں نمودار ہوا جس کی اعجاز انگیزی عقول کے سامنے ختمی دلائل کے ساتھ اور سندِ ربانی ہونے کے ساتھ انسانیت کی راہنمائی کیلئے ایک ایسے نازک ترین دور میں انسانیت کے سامنے پیش کی گئی جب انسان ایسے تاریخی حالات سے گزر چکا تھا جن میں انسانیت کا ماضی بار بار فطری ہدایات پانے کے بعد گمراہی کا شکار ہو کر اپنی عادتِ انسانیہ سے اتنا مجبور ہو چکا تھا کہ سلاسل نفس اور سلاسل شیطنت سے آزادی حاصل کرنا اس کے ضابطۂ عمل سے باہر تھا۔

جب انسانیت ایک عادت کو اپنا ثانیہ بنا لیتی ہے تو معاشرہ اس مجموعی عادت کی لپیٹ میں آکر اسی عادتِ مذمومہ کو اپنا مذہب سمجھ لیتا ہے۔ ہمیشہ انسانیت اسی عادتِ نفسانیہ کا شکار ہو کر راہِ حق سے بھٹکتی رہی اپنے فطری امن و عافیت کو خواہشات اور لذات کی بھینٹ چڑھاتی رہی اور تدریجاً نوعِ انسانیت کو متاثر کرتی رہی۔

ان تاثرات نے ایک طرف اپنے تہذیب و تمدنِ انسانیہ کو فطرت کی بنیادوں پر تعمیر نہ ہونے دیا اور دوسری طرف روحانیت کی اس جمیل ترین صورت کو بگاڑتی رہیں جو اَنفُس و آفاق' کو عبور کرنیکی صلاحیت رکھتی تھیں۔

جس روحانیت کی ذمہ داری فکر و نظر اور عالمِ ہست و بُود سے گزر کر حقیقتِ حقہ تک رسائی حاصل کرنا تھی وہ نفس کے موہوم اور مخترع خیالات کا شکار ہو کر دنیا کی اس پستی میں کھو جاتی رہی جس کا درجہ عمومیتِ انسانیہ سے گزر کر

بہیمیت کی صورت اختیار کرتا رہا۔

انبیاؑ کی مختلف بستیوں اور شہروں میں بانکرار بعثت اور ان کا جائزہ اور اُن کی تبلیغ صُحفِ سماویہ کی صورت میں شاہد ہے کہ انسان بار بار اس طرح گمراہی اختیار کرتا رہا کہ وہ حیوانیت سے متاثر ہو کر انسانیت کی تذلیل کرنے لگا۔

قرآنِ مجید نے ایسے حالات اختیار کرنیوالے انسانوں کو کَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلّ کے ساتھ تعبیر کیا ہے جو صورتِ جسمانی۔ صورتِ روحانی۔ صورتِ عقلی۔ صورتِ عملی صورتِ فنی۔ صورتِ اخلاقی۔ صورتِ تہذیب اور صورتِ تمدن ایسے اذہان کا شکار ہونے کے بعد گمراہی کی ایک جیتی جاگتی صورت بن جایا کرتے ہیں چونکہ انسان زمین پر ہر حالت میں متصرف رہا ہے اگرچہ اس کا تصرف منقطع حیثیت میں متفرق تھا اور تالیف و یگانگت سے بالکل جدا تھا پھر بھی کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ کے ضمن میں وہ جبلتہً مدنی الطبع رہا ہے۔

چنانچہ اس فطری اصول نے اس کو قریہ بہ قریہ اور شہر بہ شہر۔ ملک بہ ملک ٹولی بہ ٹولی کی صورت میں سیادت کرنے کا جذبہ دیا یہ سیادت ایسے حالات میں اس قدر مسموم ثابت ہوتی رہی جس سے انسانی صلاحیتیں ہمیشہ سر بازار پامال ہوتی رہیں۔ عوام النّاس کی صلاحیتوں کو ہمیشہ ان سیادتوں کی بھینٹ چڑھنا پڑا اور وہ عشرت خانۂ سیادت کا شکار ہوتی رہیں گویا یہ غیر مہذب سیادتیں انسانی جسم و جان کا مقتل تھیں۔

فطرت کی آنکھ بار بار انسانیت کی اس بربریت کا نہایت صبر و تحمل کے ساتھ مطالعہ کرتی رہی۔ ابنائے انسان کو حالات کے ساتھ بدلنے کا موقع دیتی رہی اور حالات کے ساتھ ساتھ وسائل بھی مہیا کرتی رہی۔

کارسازِ فطرت نے انسانی فکر کو انسان کا ہادی بنایا ہر فرد پر اس فکرِ انسانیہ

کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ استدلال کے سامنے اپنی فطری ہدایت کے ساتھ ہتھیار ڈال دے اس نظریہ کو بربریت پسند انسانوں نے بھی ہمیشہ تسلیم کیا مگر بکمال آئینِ فطرت نہ ملنے کی بنا پر اذہان کی سخت حقائق کے سامنے سربسجود نہ ہو سکی انسانی اذہان کے مطالبات ان کی عملی صورت میں تاریخ انسانیت کے ذریعے آج بھی ہمیں میسر آتے ہیں چنانچہ ارض و سما کی مختلف چیزوں کو معبود کا نام دینا اور ان کی پرستش کرنا بھی اس جذبۂ باطن کی تعبیر ہے کہ وہ الوہیت پسند ہونے کے ساتھ الوہیت کے متلاشی تھے۔ مگر ماحول کی بد اخلاقیوں اور ہدایت کا بکمال نہ ملنا۔ حالات کا سازگار نہ ہونا اور غلط اعمال کے ساتھ رہنمائی کا فقدان صراطِ مستقیم پر آنے میں ہمیشہ ایسے لوگوں کے سامنے سدِ راہ بنتا رہا۔

خالقِ کائنات اپنی مخلوقات کو جانتا ہے اور وہی علیمٌ بذاتِ الصدور ہے اس لئے ہدایتِ انسانیہ کیلئے مختلف ادوار میں انبیاءؑ کے ذریعے دعوتِ حق دینا اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ خدا نے انسانیت پر اپنی رحمت کو کبھی بند نہیں کیا اس کی اس عادت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان خود بخود ہدایت سے مفر اختیار کرتا رہا۔

اصولاً رہنمائی کے بعد ضدِ انسانیہ کا سامنے آنا اور معاشرے کا ضدِ نفسانی کے ساتھ حق سے نبرد آزما ہونا ایک ایسی حیثیتِ جاہلانہ پیدا کر دیتا ہے جس سے شرافتِ انسانیہ اور تکریمِ انسانیہ بیمار پڑ جاتا ہے جس کو ایک عظیم طبیب کی ضرورت در پیش ہوتی ہے یہ طبیب فردِ انسانیہ کا نہیں بلکہ اجتماعِ انسانیہ کا معالج ہوتا ہے اس کے نزدیک ابنائے وطن۔ ابنائے ریاست یا ابنائے اجتماعِ انسانیہ ایک بدن کی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ اس بدن کا اپنی حکمت و موعظت کے ساتھ ایسا علاج کرتا ہے جس سے اذہان میں تغیر و تبدل پیدا ہوتا ہے اس کو انقلاب

ذہنی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ذہنِ انسانی موم بتی کی طرح ہے کہ دباؤ پڑنے سے جھک جاتا ہے اگر اس پر باطل کا دباؤ پڑے تو بطلان کی طرف جھک جاتا ہے۔ اگر اس پر حق کا دباؤ پڑے تو وہ حقانیت کی طرف جھک جاتا ہے۔ یہی جھکاؤ فرد سے اجتماع میں مبذول ہو کر قوم کی عادتِ ثانیہ بن جاتا ہے جس کو کسی انقلاب آفریں دلیل سے اور انقلاب آفریں عمل ہی سے حق کی طرف موڑا جا سکتا ہے۔

پروردگارِ عالم اپنی عادتِ کریمانہ کے ساتھ نوعِ انسانیت کے اذہان پر دلائل و براہین حقہ کے ساتھ موعظت فرماتا رہا اور اذہان کو بار بار اپنی طرف متوجہ کرتا رہا۔ اسی تکرارِ فطری نے انسان کو ہمیشہ حق کیلئے آمادہ رکھا اگر یہ تکرارِ موعظت متواتر جاری نہ رہتا تو انسانیت کبھی تکریمِ انسانیت کا سُراغ نہ پا سکتی اور بَلْ ھُمْ اَضَلُّ کا دائمی شکار ہو جاتی۔

اس ہادیانہ شعارِ حق نے اپنے انوارِ کریمانہ سے قلوب کو ہمیشہ چمکایا اور نورِ باطن کو زیادہ جلا بخشی یہ روشنی صحت مند عقول و قلوب میں اس طرح محفوظ رہی جس طرح آفتابِ عالمتاب کی روشنی کی حرارت اس کے غروب ہونے کے بعد ذرات کے سینوں میں پنہاں ہو جاتی ہے۔ یہی پنہائی حرارتِ زمین کی روئیدگی میں کارفرما ہو کر حیاتِ جسمانیہ کو برقرار رکھتی ہے جس کا مطلب فطرت کی نظر میں یہ ہوتا ہے کہ زمین کے ذرات کی حرارت پر جب بھی موسمِ بہار آئے اس میں اُس سے استفادہ کرنے کی صلاحیت موجود رہے من وعن اولادِ آدم انبیاء کی ہدایت سے جو بار بار طلوع ہو کر غروب ہوتی رہیں انسانی سینوں پر اپنی حقانیت کی حرارت چھوڑتی رہیں جس کے نتیجے میں انسانیت گمراہی کی موجودگی میں مائل بہ حق رہی تاکہ دوسرے آفتابِ ہدایت کے طلوع ہونے پر اس میں

حرارتِ حق کی آگ سُلگتی رہے۔ اور حیات بخش جذبات کی متاع اس کے پاس موجود رہے اور اس کے سازِ زندگی میں وہ آوازیں باقی رہیں کہ آنیوالا ہادی اپنی انقلاب انگیز دعوت سے ربابِ حیات کی ان آرزوں کو اپنے سازوں کے ساتھ بلند کر سکے نغماتِ انسانی کو نغمائے رُوحانیت میں ارتعاش دیکر انسان کو اپنی حقیقی تہذیب و تمدّن کی طرف بلائے اور اسے اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی تلقین کرے جزدی طور پر ہر نبیؑ کی بعثت کسی قریہ یا شہر کے لئے یا ملک کیلئے انقلاب انگیز تھی۔ یہ انقلاب مادی نہیں بلکہ رُوحانی انقلاب تھا۔

اس رُوحانی انقلاب سے زمرۃ الانسان میں انبیاءؑ کے ذریعے انقلاب لانیکی حکمتِ خداوندی یہ تھی کہ روح لازم اور مادہ ملزوم ہے۔ جب لازم میں انقلاب آجائے تو ملزوم انقلاب سے بچ نہیں سکتا اس واسطے کہ ہر ملزوم اپنے لازم کے ساتھ ہوتا ہے بغیر لازم کے ملزوم کا وجود محال ہے عقائد کا انقلاب موہوم خیالات پر ہوا انسانیت کی توہم پرستی۔ کہیں پتھر کی مورتیوں اور کہیں سونے چاندی۔ لوہے اور پیتل کی مورتیوں کو اور کہیں اپنے جیسے انسانوں کو۔ کہیں شجر و حجر کو۔ کہیں دریاؤں اور ستاروں کو پوجتی تھی کہیں حیوانیت کی پرستش ہوتی تھی اور ذلیل سے ذلیل ترین اطوار پرستش کیلئے مہیا کیئے جاتے تھے۔

انسانیت کی اس مذموم توہم پرستی نے کہیں بعل پرستی کی اور کہیں اشترات پرستی کی عورتوں نے مردوں اور مردوں نے عورتوں کی پرستش کی گویا انسانی آبادی اپنے ازہان کی امانتوں کو نفس کے ہاتھوں بار بار فروخت کرتی رہی۔

ان حالات میں عادتِ انسانیہ کا گوشۂ عقل ایسے اعجاز انگیز آئین کے انتظار میں تھا جو اس کو اپنی سچائیوں کے ساتھ مطمئن کرتے ہوئے راہِ راست پر چلانے میں تحریص و ترغیب دے سکے تورات۔ انجیل۔ زبور۔ صُحفِ سماویہ ایک مکمل

ضابطۂ حیات کے مختلف اجزا تھے جو اپنے زمانوں میں تبلیغ کے فرائض انجام دیتے رہے اور ان کے مبلغ عظیم المرتبت انبیاءؑ تھے تاریخ عیسوی زمانے کے سامنے اپنے جزوی آئین کے ساتھ جزوی اعمال کی ترجمان ہے اس لئے انسانیت کو اس سے کامل طمانیت میسر نہ آسکی۔

آئین کیلئے انسانیت تشنہ لب رہی چنانچہ اللہ تعالےٰ نے اہل توراۃ اور اہلِ انجیل سے وعدہ فرمایا تھا کہ تمہیں ایک آخری نبیؐ کے ذریعے آخری کتاب دی جائیگی اس لحاظ سے وہ مکمل آئینِ فطرت کتاب کی صورت میں موعود کی حیثیت اختیار کر گیا۔

اللہ تعالےٰ نے اپنے وعدہ کو اس طرح پورا فرمایا۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ وعدہ ربانی کا آخری نبی اور آخری کتاب کی صورت میں پورا ہونا اعجازِ قدرت اعجاز نبوت اور اعجازِ کتاب تھا اس حالت میں ظاہر ہے کہ قرآنِ مجید کا حرفِ اوّل انقلاب انگیز تھا جس نے پوری دنیا کے اذہان کو ایک کتاب۔ ایک نبیؐ اور ایک خدا کی طرف مبذول کر دیا۔

قرآنی تعلیمات میں عقائدِ اسلامیہ ایک ضمنی نظریہ کی حیثیت رکھتے ہیں آج تک دُنیا کا کوئی آئین یا منشور بغیر نظریہ کے مرتب نہیں ہو سکا۔ ہر آئین۔ ہر منشور یا اس کی غرض و غایت کا پس منظر ایک نظریہ ہوتا ہے اور اسی نظریہ پر منشور مرتب ہوتا ہے منشور اس تفصیلی عمل کا نام ہے جس پر دعوتِ عمل دی جاتی ہے اور یہی دعوتِ عمل تہذیب و تمدن کی بنیاد ڈالتی ہے اور پھر تہذیب و تمدن ہی نظریات کے مکمل اور نامکمل ہونے کا مظہر ہوتے ہیں جس قوم کے تہذیب و تمدن میں اخلاق کا فقدان ہو۔ وہی فقدانِ اخلاق نظریۂ قوم کے ضعیف ہونیکی دلیل ہوتا ہے ہر نظریہ منزل چاہتا ہے منزل جتنی چھوٹی ہوگی نظریہ بھی اتنا ہی

چھوٹا ہوگا اور منزل جتنی طویل ہوگی نظریہ بھی اتنا ہی طویل ہوگا منزل اگر لامتناہی ہوگی تو نظریہ بھی لامتناہی ہوگا۔

نزولِ قرآنِ مجید سے قبل اور بعثتِ نبی آخر الزمان ؐ سے قبل تمام منازلِ اقوام نظریہ فطرتِ انسانیہ کے سامنے چھوٹی منازل تھیں جن پر انسان وسعتِ نظر کے ساتھ اپنے افکار کے گھوڑے نہیں دوڑا سکتا تھا اس کے افکار کے گھوڑے مختصر منزل پر رک جاتے تھے اور یہ محدود جادۂ انسانیت انسانیت کو مطمئن نہ کر سکا۔

اسی نظریۂ فطرت کے پیشِ نظر مزاجِ انسانی کے مطابق پروردگارِ عالم نے قرآنِ مجید جیسے ضخیم ضابطۂ حیات کے ساتھ عقائد کا وہ لامتناہی نظریہ پیش کر دیا جس کی حدیں یوم النشور تک طویل کر دیں اور طمانیت کی انتہا اور لافانی منزل خوشنودیٔ رب کے ساتھ آخرت کو قرار دیا تاکہ فکرِ انسانی کو افکار کی رفتار تیز رکھنے میں کبھی رکاوٹ محسوس نہ ہو اور وہ زندگی کے مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی اپنے رب کی جستجو میں سرگرمِ عمل رہے۔

چنانچہ قرآنِ مجید نے عقائد پر سیر حاصل بحث فرمائی اور قرآنِ مجید کا سب سے پہلا مخاطب انسان ہی قرار پایا جس کے عقل و دل و نگاہ کو لَا مَعْبُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ اور لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ کے رموز سے باندھ کر جادۂ زیست پر اپنے مجوزہ عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاق کی سبیلوں پر چلا دیا۔

چونکہ انسان اپنے ماضی کی عادت میں اپنے نامکمل نظریات کے ساتھ نامکمل عبادات۔ نامکمل معاملات اور نامکمل معاشرت سے مالوس تھا اس نامکمل اُنس کی بیخ کنی کیلئے ایک کامل نظریہ کے ساتھ اسے کامل اعمال سے نوازا۔ اس نورانی عقیدہ نے ذہنِ انسانی کو سچی عبادتوں کے ساتھ خدا سے مالوس کر دیا جس

کے نتیجے میں آغازِ اسلام یعنی صدرِ اوّل کے دور میں اپنے معاملات فطریہ اسلامیہ پر حاوی ہو گیا اور اسلام کا تہذیب و تمدن اپنے فطری خطوط پر مرتب ہونا شروع ہو گیا آغازِ عمل میں اسلام نے سب سے پہلے ان تمام غیر فطری توہمات کی بیخ کنی کی جو ارتقائے انسانیت کیلئے سدِ راہ تھیں۔

اسلام کی حقانیت کی پہلی ضرب کاری رہبانیت اور کاہنیت پر پڑی کیونکہ یہ لوگ اس دلپذیر انداز سے ترکِ دنیا کرتے تھے کہ انسانی طبائع بے ساختہ ان کی طرف مائل ہو کر ترکِ دنیا کیلئے مجبور ہو جاتی تھیں۔ یہی مجبوری حصولِ مقصود مطلق کی راہ میں آڑے آتی رہی اور انسان اپنے فطری علوم سے بے بہرہ ہو کر معلومات سے دُور ہوتا رہا۔

اس قسم کی عبادات و معاملات نے انسانیت کو پھلنے پھولنے اور معراجِ کمال حاصل کرنے میں ہر گام پر روکا۔ اُن راہبوں اور کاہنوں کے مجاہدات ترکِ دنیا پر محمول تھے حالانکہ دنیا ہی دسترخوانِ علم و عمل اور دسترخوانِ معلومات ہے اور دنیا ہی وہ عالمِ اسباب ہے جس کو عبادت کا ذریعہ بنایا جاتا ہے اور دنیا ہی زندگانیٔ دنیا کا سامان ہے۔ بعثتِ نبوت کیلئے بھی اس دنیا کو تجویز کیا گیا اور نزولِ قرآن کیلئے بھی اسی دنیا کو تجویز کیا گیا اور مکہ معظمہ کو بھی اسی دنیا میں تجویز کیا گیا اسی دنیا کیلئے اس کو مرکزِ عبادت بنایا اور فرمایا گیا:-

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ط

"یعنی سب سے پہلا گھر دنیائے انسانیت کی ہدایت کیلئے وہ ہے جو مکہ مکرمہ میں بنایا گیا۔ اور سارے جہانوں کی ہدایت کیلئے بنایا گیا"۔

یہی دنیا انبیاءؑ کا معمل خانہ رہی اسی پر سعادت دارین کے تجربے کیے گئے یہی دنیا مصلّے گاہِ عُبّاد و زہّاد رہی ایک لاکھ کئی ہزار انبیاء و مرسلین اسی زمین پر مبعوث ہوتے

آدم علیہ السلام کو جنت سے نکال کر اسی دنیا میں بسایا گیا اور دونوں میاں بیوی نے اسی دنیا میں بنائے انسانیت ڈالی اور اس کیلئے کھیتی باڑی کی ابتدا کی اور نشیمن کا آغاز کیا اسی دنیا پر سلاطین نے حکمرانی کی اور انسانوں کو حکمرانی کے ضابطوں میں پابند رکھا اسی دنیا کے سونا و چاندی کو زیور جان بناتے رہے اسی دنیا کی پورب و پچھم کی ہواؤں نے دانۂ گندم کو پالا۔ اسی دنیا کی مٹی سے دانہ گندم نے نمود پائی۔ اور اس دنیا کے انسانوں کے لیے وہ رزق کا باعث بنا۔ اسی دنیا کا پانی پی کر انسانوں نے اپنی پیاس بجھائی۔ اسی دنیا کے شمس و قمر سے انسانی زندگیوں نے حرارت پائی۔ اسی دنیا کے کواکب سے انسانوں نے اپنی راہیں ڈھونڈیں اور منزل کا سراغ لگایا۔ اسی دنیا کے لیل و نہار سے انسان وابستہ رہے اس دنیا کی وہ کونسی ایسی چیز ہے جس کو راہبوں اور کاہنوں اور سادھوؤں نے استعمال نہیں کیا اگر ان کو ترکِ دنیا بھی متاعِ دنیا سے بچا نہ سکی تو ظاہر ہے کہ ایسی رہبانیت ایسی کاہنیت اور ایسی سادھویت کی بنیاد نفاق پر مبنی ہو گی۔

جس عبادت کی بنیاد نفاق پر مبنی ہو وہ اللہ کو کیونکر پا سکتی ہے یہ بڑا تجربۂ انسانیت تھا جس نے ایک طرف دانۂ گندم کھایا اور دوسری طرف اُس سے ہجرت اختیار کی اور تیسری طرف مہاجر بننے کے بعد بھی اس سے نہ بچ سکا۔ غاروں میں۔ دشت و جبل میں صحراؤں میں جہاں بھی دنیا سے بھاگتا ہوا گیا دنیا اس کے زیر بار رہی وہ دنیا کی ہواؤں میں سانس لیتا رہا اور دنیا کا پانی پیتا رہا اور دانۂ گندم کھاتا رہا اور دنیا کی نباتات کے کپڑے پہنتا رہا۔

نہ جانے ان سب چیزوں کی موجودگی میں وہ کیسے تارک الدُّنیا کہلاتا رہا اس توہم پرستی نے انسانیت کو جادۂ حق پر چلنے کی شجاعت سے محروم کر دیا تھا انسان بزدل۔ شرمندہ۔ کام چور ہو رہا تھا۔ اور فطرت کی پیہم خلاف ورزی پر آمادہ کار ہو چکا تھا پیغمبر خدا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم ایک ظلم و عدوان کے

زمانے میں رحم و کرم کا مجسمہ بن کر آئی تھی اور اسی رحم و کرم کی تبلیغ کے ساتھ وہ ظلم و عدوان کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے آپؐ نے رہبانیت کی تبلیغ ہرگز نہیں کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں وہ خدا شناس راہب جنھوں نے نفاقِ نفسانی کو ختم کرنے کیلئے تزکیۂ نفس کیا تھا سر بازار خدماتِ انسانی کے فرائض انجام دے رہے تھے بعد کے مسائلہ پسند مذہبوں نے ترکِ دنیا کی بنا ڈال کر مذہب کے عملی خطوط سے اپنی قوم کو ہٹا دیا جس کے نتیجے میں وہ لوگ کسی داعیٔ برحق کی حق پسندانہ تلقین برداشت کرنے کے اہل نہ رہے چنانچہ پروردگارِ عالم نے وقت کی سب سے بڑی ذہنی مصیبت کا حل اسلامی عقائد اور عبادات و معاملات کے ساتھ اس طرح کیا کہ اعلائے کلمۃ الحق بہ لسانِ قرآنِ مجید بہ لسانِ نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام بلند ہوا۔

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

"یعنی اے بنی نوعِ انسان! تم سب اس پروردگارِ عالم کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا فرمایا تاکہ تم صحیح متقی بن سکو۔ وہ اللہ جس نے زمین کو تمہارے لئے بچھونا بنایا اور آسمان کو تمہارے لئے سائبان بنایا اور بلندیوں سے تمہارے لئے پانی برسایا اور اس سے پھل پھول پیدا فرما کر تمہاری روزی کا انتظام فرمایا۔ لہٰذا تم ایسے خدا کی موجودگی میں اس کیلئے کسی کو شریک مت کر ڈالو۔ اس حالت میں کہ تم جانتے ہو۔"

ان آیات میں قرآنِ مجید کی مخاطب نوعِ انسانیت ہے قرآنِ مجید کی ہمہ گیر تبلیغ جنبہ داری سے بلند و بالا ہو کر اللہ کی مکرم مخلوق کو راہِ حق پر چلنے کی دعوت

دیتی ہے اس آواز نے بھولی ہوئی دنیا کو حقیقت کی جانب راغب کر دیا یہ آواز باطل کو لرزہ براندام کر دینے والی عقول و قلوب کو تسخیر کرتی ہوئی ہر نگاہ کو نبی آخر الزمان علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی طرف متوجہ کر دینے کیلئے مجبور کر رہی تھی۔

اسی توجہ انسانیت پر قرآنِ مجید نبی آخر الزمان کی پیہم معجز نمائی۔ سخت اذہان کو اس طرح نرم و گداز کر رہی تھی جس طرح بھٹی میں لوہا گرم ہونے کے بعد پیہم ضربوں سے ہتھیار بن جاتا ہے۔ بعینہ سخت اذہان ہدایت کی متواتر ضربوں سے ڈھل ڈھل کر "سیف اللہ" بن رہے تھے۔

اس کے بعد منفرق۔ متزلزل اور متذبذب، عبادات کو کامل اور مستقل عبادتوں میں اس معجز نمائی کے ساتھ تبدیل کیا گیا کہ رہبانیت اور کاہنیت کی بجائے صحیح تزکیۂ نفس۔ صحیح ضبطِ نفس اور استقامت کے ساتھ معینہ اوقات میں عبادت کو تنفیذ فرمایا گیا تاکہ معاملاتِ انسانیہ کو بھی پھلنے پھولنے کا موقع مل سکے اس فطری تقسیم اوقات نے عبادات و معاملات کو اس عدل و انصاف کے ساتھ معاشرے میں تقسیم کر دیا جس سے ضیاع وقت سے قوم کو مکمل امان ملی۔ قرآنِ مجید کی تقسیم اوقات سراسر فطرت کی ترجمان ہے جس پر کوئی فکر سلیم اعتراض نہیں کر سکتی چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ؕ

نماز مومنوں کیلئے وقت معین کے ساتھ مقرر فرمائی گئی اس کے علاوہ معاملات انسانیہ کی اتنی زیادہ تاکید فرمائی گئی کہ اس سے فرار ناقابلِ معافی جرم قرار دیا گیا اس انوکھی تبلیغ نے معاشرے کو روحانی۔ بدنی۔ علمی اور عملی میدان میں متحرک کر دیا۔ یہ تحریک ایک منظم مشین کی طرح بروئے کار آیا کہ امرِ الٰہی اور امرِ رسول نے یکبارگی تمام پیروکارانِ اسلام کو حرکت دے دی یہ اتحادی حرکت آئینِ فطرت کے مکمل ہونے کی دلیل تھی۔

ریگزارِ عرب کے اس آئینی تہذیب و تمدّن نے انسانی دنیا میں تہلکہ بپا کر دیا نزولِ قرآن اور اس پر عملِ پیہم کی آواز نے بڑے بڑے فراعنہ اور نمارود زمانہ کو اس فطرت کی آواز کی طرف متوجہ کر دیا قرآنِ مجید کی پہلی آواز نے کائنات والوں کے دلوں کو اللہ تعالےٰ کی طرف موڑ دیا تھا۔ اسلام نے رہبانیت اور کاہنیت کی اصطلاح کا ردِّ عمل اپنی فطری عملی اصطلاحِ فقر کے ساتھ اسطرح کیا۔ اَلْفَقْرُ فَخْرِی

حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام اس اَلْفَقْرُ فَخْرِی کا ترجمہ خدائے لم یزل کے سامنے انتہائی عبودیت کے اظہار کا تھا اور مسلمانوں کیلئے بھی اس اصطلاحی فقر کی تجویز فرمائی کہ وہ بارگاہِ ربِ جلیل کے سامنے ہمہ وقت عاجزی وانکساری کے ساتھ اپنی عبودیت کا اظہار اس طرح کریں کہ اللہ تعالےٰ کے درِ اقدس کے فقیر ہو کر کائنات پر امیری حاصل کر لیں اور شاہی میں بھی فقیری کا مزاج پیدا کر کے اپنی عاجزی کا ثبوت پیش کریں اور نہایت عزبت میں شاہی استغناء کا منظر پیش کرتے ہوئے غیر اللہ سے بے نیازی کے ساتھ اپنی کامل عبودیت کا اظہار کریں۔

اسلام نے لَا رَھْبَانِیَّۃَ فِی الْاِسْلَام فرما کر لفظِ رہبانیت اور افعالِ راہبانہ کو ہمیشہ کیلئے دائرہ اسلام سے خارج کر دیا۔ قرآنِ مجید نے معاملات کی تشریح انفاقِ مال کے ساتھ اقتصادی نظام کو درست کرتے ہوئے مساوات پر زور دیا اور اکابرینِ قوم کو عوام کی قولاً اور عملاً خدمت کرنیکی شدید تاکید فرمائی کہ وہ اپنی اپنی صلاحیتوں کو عوام کیلئے بروئے کار لائیں اور عوام وخواص کو اخلاقِ باطن کے ساتھ اعمالِ ظاہریہ کی تعلیم دیکر اسلام کی صداقتوں پر روشنی ڈالنے کا فرض انجام دیں اور راستے سے ایک اذیت ناک کانٹے کے اٹھانے سے لیکر ایوانِ شاہی تک کے انتظام پر مفصّل بحث اور بری وبحری راستوں کو امنِ عالم کیلئے استوار کرنے کی دعوت دی اور یہاں تک اخلاقی عملِ اسلام کو ظاہر کیا گیا کہ غیر مسلم پڑوسی کے

ساتھ بھی روا دارانہ سلوک کیا جائے اور عالم انسانیت سے ایسے باہمی معاملات کے ساتھ ربط قائم کیا جائے کہ وہ اخلاقِ اسلامی سے متاثر ہو کر دعوتِ حق کو قبول کرے اس اخلاقی تعلیم کیلئے پوری ملّتِ اسلامیہ اور اس کے علمائے کو مامور کیا گیا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

"یعنی تم ہی بہتر امت ہو اس واسطے کہ تم لوگوں کو اچھائی کی طرف بلاتے اور برائی سے منع کرتے ہو۔"

اس آیت میں عام امت کی تعریف کی گئی ہے پھر علمائے اُمّت کیلئے ارشاد ہوتا ہے:۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

"یعنی تم میں ایک ایسے مخصوص گروہ کا ہونا ضروری ہے جو اچھائی کی طرف دعوت دے اور برائی سے منع کرے۔"

اس آیت میں علمائے حق کی تبلیغی ضرورت پر اُمّت کی توجہ کو مرکوز کیا گیا ہے ان آیات میں خواص و عوامِ اسلام دونوں کو قولاً و عملاً عبادات و معاملات اسلامی معاشرت اور اخلاقِ اسلامی کے ساتھ دعوتِ حق کا اہتمام کرنے کی تعلیم دی گئی ہے اور أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کے الفاظ سے یہ ثابت ہوا کہ زمین کے فاصلے بغیر سامانِ سفر کے پورے نہیں ہو سکتے اور یہ کہ ہر وہ سامان جو انسانیت تک تبلیغ حق پہنچانے میں ممد ہو سکتا ہے اس کو حاصل کرنا اُمّت کیلئے ضروری ہے اور یہ بھی ثابت ہوا کہ اُمّت کو ہر زمانہ سے گزر کر انسانیت تک تبلیغ کو پہنچانا ہے اور ہر زمانہ کے مطابق جدید تقاضوں کے پیشِ نظر اس کو سامانِ رسل و رسائل۔ سامانِ ابلاغ مہیّا کرنا ضروری ہے ورنہ بری و بحری راستوں سے گزر کر بلند و بالا چٹانوں کو عبور کر کے اور غیر معلوم راہوں سے بلا سامانِ سفر گزر کر تبلیغ کرنا مشکل تر بن ہو جاتا ہے۔

اس سے وقت کی ان تمام مشینوں کا حاصل کرنا ثابت ہوگیا ہے جن کی دورِ جدید میں انسانیت کو ضرورت ہوسکتی ہے۔

قرآنِ مجید معاشرت کی تشریح ریاست کی فلاح و بہبود کے ساتھ کرتا ہے اور معاشرے کی فرداً اور اجتماعاً آسودگی چاہتا ہے انتظامِ ملکی ایسے مقدس ہاتھوں میں سونپنا چاہتا ہے جو ریاست کے باشندوں کیلئے شفیق ہوں۔ سیاسی حُسن انتظام کو اس انداز سے ریاست پر مسلّط کرنا چاہتا ہے جس سے عوام کی کارگردگی کی صلاحیتیں نمودار ہوکر انتظامِ ملکی میں معاون ہوسکیں قرآنِ مجید معاشرت میں ایک فریادی کی فریاد عدالتِ عُظمیٰ میں اس طرح پیش کرتا ہے۔

پیشِ قرآں بندہ و مولا یکے است

بوریا و مسندِ دیبا یکے است

معاشرتِ اسلام حُسنِ اخلاق کا نمایاں چہرہ ہے جس کا شاداں و فرحاں ہونا قلب و جگر کی مسرت کا آئینہ دار ہوتا ہے اور معاشرت اس صحت مند حقیقت کا نام ہے جس کا صحت مند ہونا سیاست ملکی کے صحت مند ہونیکی بیّن دلیل ہے ریاست کے کلی معاملات پر سیاست کا تصرّف اتنا حسین ہو کہ معاشرہ احکاماتِ ملکی و ملّی کی تعمیل بخوشی انجام دینا شروع کر دے۔

جو معاشرہ احکامات کی تعمیل میں تساہل برتتا ہے اس معاشرے کا تساہل سیاسی انتظام کے نامکمل ہونے کی علامت ہوتا ہے قرآنی تعلیمات مُلکی و ملّی حُسنِ انتظام کے ساتھ مجموعی طور پر معاشرے کو عملِ پیہم کی دعوت دیتی ہیں اجزائے معاشرت کی اصلاحات کے ساتھ ہی حُسنِ معاشرت معرضِ وجود میں آتا ہے۔

قرآنِ مجید کی نظر میں سیاست حُسنِ انتظام کا نام ہے نہ کہ حُسنِ کذب کا اسلامی سیاست علمبردارِ حق و صداقت ہوتی ہے اس کا انتظام ریاست کی داخلی اور خارجی

حیثیات کی جامعیت اور مانعیت کی حیثیت پر ہوتا ہے وہ ریاست کے داخل و خارج میں ایک ایسی مضبوط دیوار کی حیثیت رکھتی ہے جو صلاحیات و حیثیاتِ ملکی کی جامع اور مہلکاتِ داخلیہ اور خارجیہ کیلئے مانع کی مانند ہوتی ہے۔

سیاسی دیوار کا مستحکم ہونا ریاست کے لئے دیوارِ حوض کی مانند ہے اگر دیوارِ حوض کمزور ہو تو کسی بھی وقت اس کے ٹوٹ جانے کا امکان ہو سکتا ہے دیوارِ جب بھی ٹوٹ جائے گی حوض کی جامعیت ختم ہو جائے گی اور دیوار حوض جتنی مضبوط ہو گی حوض کی جامعیت کی بقا کا پیش خیمہ ہو گی اور مہلکاتِ خارجیہ کیلئے ایک قومی حصار کی صورت میں مانع ہو گی۔

دنیائے انسانیت میں جہاں کہیں بھی سیاسی انتظامات غیر مستحکم ہوئے اس ریاست کو بربادی کا سامنا کرنا پڑا۔ اسلام استحکام ملکی کے ساتھ تبلیغ چاہتا ہے اسلام کی یہ معاشرت کائنات پر تفوق و برتری رکھتی ہے۔

قرآنِ مجید اخلاقِ اسلامی کی تشریح تقویٰ کے ساتھ کرتا ہے اس تقویٰ کے ساتھ جس کا تعلق "ایمان بالغیب" کے ساتھ ہو اور اقامتِ صلوٰۃ۔ انفاقِ مال ایمانِ بالکتب اور یقینِ آخرت پر ان طرز و اطوار کے ساتھ تعلیمِ اخلاق دیتا ہے جو حُسنِ نیت سے اُٹھ کر حُسنِ عمل کی صورت اختیار کرے۔

اسلام نے اخلاق میں قول کا بڑا دخل ثابت کیا ہے اس واسطے کہ حُسنِ کلام دل پر اثر انداز ہوتا ہے یہ اخلاق کا بنیادی پہلو ہے اور دوسروں کے دلوں پر اثر انداز ہونا اس کی تاثیر ہے اخلاق کی جسمِ انسانی میں قدرتی طور پر دو صورتیں بنتی ہیں اخلاقِ نفسانی اور اخلاقِ رُوحانی۔

قرآنِ مجید کی جملہ تعلیمات صاحبِ ایمان کو ایمان سے ابتدا کرنے کی اس واسطے تاکید کرتی ہیں کہ جسمِ ثقیل کے ذرّے ذرّے میں صرف روحانیت ہی کارفرما

ہے ورنہ وہ بیکار مُردہ کی حیثیت رکھتا ہے اس کی جُملہ حرکات وسکنات رُوح پر مرتب ہوتی ہیں لہٰذا اس کی تعلیمات حقائق کے پیشِ نظر دل کی نیّات کو پاکیزگی کی تعلیم دیکر رُوح میں تلاطم پیدا کرکے ارادوں کو ہمنوا کرتے ہوئے اعمال کی صُورت اختیار کرنے پر آمادہ کرتی ہیں اخلاقِ اسلامی کا منشاء اپنی ذاتی خواہشاتِ نفسانی اور ضروریات کو مدِنظر رکھتے ہوئے دوسروں کی ضروریات کی تکمیل ہے اخلاقِ اسلامی جو چیز اپنے لئے پسند کرتا ہے وہی چیز اسی طرح دوسروں کیلئے بھی پسند کرتا ہے اخلاقِ اسلامی جذبات کشی۔ مردم آزاری سے بچنے کی ترغیب دیتا ہے۔

اخلاقِ اسلامی متاعِ زیست تک کو حق وصداقت پر قربان کرنے کیلئے سعادت محسوس کرتا ہے اخلاقِ اسلامی۔ اسلام کی ہدایات پر اس واسطے عمل پیرا ہونے کی کلیتہً دعوت دیتا ہے کہ اسلام جُزءً اور کُلاً مجموعۂ اخلاق ہے اس کی کوئی شق اخلاق کے سوا نہیں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ط

"یعنی اے ایمان والو! اسلام میں پُورے پُورے طریقے سے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو کہ وہ تمہارا علی الاعلان دشمن ہے"

اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ کی صحیح تشریح باضابطہ اعمالِ اسلام کی پیروی ہے جو اخلاقیات پر مبنی ہے اور اسلامی اعمال سب کے سب نیکیاں ہیں اور ہر نیکی اخلاق کی جُزو ہوتی ہے اور نیکی ہی منفعت کے میدان میں انسانیت کے لئے سودمند ثابت ہوتی ہے۔ اخلاق اس فراوانی سعادت کا نام ہے جو بہمہ وجوہ خیر الناس اور نفع الناس پر معمول ہو اور ہر وہ عمل شیطان کی تخلیق ہے جو جو انسانیت کے لئے اذیت کا موجب ہے

اور ہر قسم کی اذیت نوعِ انسانی کیلئے جذبات کشی اور مردم آزاری کا باعث بنتی ہے۔

اس واسطے مسلمانوں کو اسلامی اخلاقِ حمیدہ سے ہٹ کر شیطان کی بُرائیوں کی پیروی کرنے سے منع کر دیا گیا ہے اور اس کی راہوں پر چلنے سے ممانعت کر دی گئی ہے تاکہ وہ کسی طرح بھی اذیت ناک بُرائیوں سے ہمکنار نہ ہو سکے اور اپنے دامنِ اخلاق کو امانت و دیانت کے ساتھ بچاتا ہوا عافیت کا مظاہرہ کر سکے اسلام کی جملہ عبادات و معاملات عافیت کے نشانات ہیں۔

اخلاق کا تعلق تعلیماتِ اسلامیہ کے ساتھ ساتھ تاریخِ اعمالِ اسلامیہ سے زیادہ ہے اور اخلاق کا تعلق انبیاءؑ۔ صدیقین۔ شہداء اور صالحین کے اقوال و افعال کے ساتھ وابستہ ہو کر تربیت پاتا ہے اخلاق کیلئے صالحین کی تقلید کرنا ازبس ضروری ہے جس کو تاریخ تصوّف میں طریقت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اسی واسطے علمائے اسلام نے تصوّف کو اخلاق کا نمونہ قرار دیا ہے اور تصوفِ اسلام ہی معیارِ اخلاق ہو نیکی اہلیت رکھتا ہے تمام صحابہؓ کبارؓ شریعت اور طریقت کے فرمانبردار تھے اور یہاں طریقت سے مُرادرسمی رواجی یا عجمیانہ طریقت نہیں ہے بلکہ اسلامی تعلیمات کی تعمیل میں جو اعمال مرتب ہو کر سامنے آئیں ان کے احوال کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے کا نام طریقتِ اسلامیہ ہے۔

حضور سرورِ کائنات۔ فخرِ موجودات علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے تعمیلِ احکامِ الٰہی کے ساتھ جو اقوال۔ افعال اور احوال حاصل کیے وہ آپؐ کی فرمانبرداریٔ حق کے نتیجہ میں مرتب ہو کر سامنے آئے آپ ازلی طور پر نبیؐ تھے مگر میدانِ تعمیل میں بعثت

نبوت سے دمِ واپسین تک ختمی طور پر جن احوال۔ اقوال اور افعال کی آپ نے تکمیل فرمائی وہ سُنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم ہو گئے ان کی تقلید طریقہ نبوت کی تکمیل تھی یہ طریقتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر مرتب ہوئی اور تابعینؒ نے صحابہ کی طریقت کی تقلید کی شجرہ تقلیدِ طریقت کی تکمیل کا آغاز قرآن مجید کی اس آیتِ کریمہ سے ہوا۔

مَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا

" یعنی جو کچھ تمہیں رسولِ پاک صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم دیں اس کو اختیار کرو اور جن چیز سے وہ منع فرمائیں اس سے باز آجاؤ۔"

ظاہر ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی اُمت کو قولاً۔ عملاً اور اصولاً نیکیوں کا حکم دیا۔ اور برائیوں سے منع کیا یہ ترتیب تعمیلِ تقلید مراطِ طریقت پر ہی میسّر آسکتی ہے چنانچہ اسلام نے ہر شعبۂ زندگی میں اسی تعمیلی پروگرام کو طریقت کی تقلید سے ہی سرانجام دیا۔

تجارت۔ صنعت وحرفت۔ تبلیغ وحکمت۔ سیاست اور تصرفِ ملکی۔ فردی۔ اجتماعی طور پر جہاں بھی اور جس طرح بھی افرادِ اسلامیہ کو موقع ملا۔ اسلام کے اخلاق کے نمونہ کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کو جزوی اور کلّی طور پر سرانجام دیکر اخلاف اسن نی پیش کیا۔

اَلدِّیْنُ کُلُّہٗ اَدَبٌ دین سارے کا سارا مجموعۂ ادب ہے حاکم کا محکوم سے انصاف اور زردادازی۔ امیر کا غریب سے حُسن سلوک۔ عالم کا جاہل سے تلطف، قوی کا ضعیف سے حُسنِ مروّت۔ صحت مند کا مریض سے حسنِ مدارت۔ مقیم کا مسافر سے حُسن التفات۔ مظلوم کو ظالم کے پنجۂ استبداد سے بچانا۔ معاشرے سے بدعنوانیوں کو دُور کرنا ہر نشیب کو فراز اور ہر فراز کو اعتدال پر لانا

عدل و انصاف کو بروئے کار لانا۔ ازدواجی زندگی کو فطرت کی نہج پر چلانا اولاد کی اعلیٰ تربیت۔ خاندان کی پرورش۔ پڑوسی کے حقوق کی نگہداشت۔ یتیم کے مال کی حفاظت۔ بیوگان کی خدمت۔ دردمندوں۔ آفت رسیدہ لوگوں کی خبرگیری۔ سفید پوشوں کی دادرسی۔ بڑوں کا ادب۔ چھوٹوں سے شفقت۔ مہمان کی تواضع۔ نوعِ انسانیت سے پیار۔ امن عالم کی تبلیغ۔ بھولے بھٹکے ہوئے کو راہ دکھانا۔

مصیبت میں دستگیری کرنا۔ ایفائے عہد۔ روٹھے ہوئے لوگوں کو منانا اور بچھڑے ہوؤں کو ملانا۔ علم و عمل کی دعوت دینا۔ درس و تدریس کے مشاغل کو جاری رکھنا۔ راستوں کو ٹھیک کرنا۔ ماں۔ باپ۔ استاد اور معلمینِ قوم۔ محققینِ قوم اور مدبرینِ قوم کی توقیر کرنا۔ کاروباری زندگی میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانا۔ ذخیرہ اندوزی سے بچنا۔ بیع و شراح میں انصاف کو ملحوظ رکھنا۔ ہر قسم کے حرام سے بچنا اور لوگوں کو بچانا۔ جلب منفعت کی خاطر دوسروں کو نقصان پہنچانے سے بچنا اور لوگوں کو بچانا۔ کسی کا دل نہ دکھانا۔ خدا کی معینہ حدود کے اندر رہنا اور تجاوز سے بچنا وغیرہ۔

یہ سب چیزیں دستورِ اخلاقِ اسلامیہ میں داخل ہیں ان میں سے ہر شق کی حفاظت اخلاقِ اسلامیہ کی حفاظت ہے۔

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

نعت

سامنے اُن کی ذات ہوتی ہے
وجد میں کائنات ہوتی ہے
اُن کے در پر جو رات ہوتی ہے
وہی شب تو برات ہوتی ہے
لب پہ اُن کی جو نعت ہوتی ہے
جھومتی کائنات ہوتی ہے
آرزو میں جو اُن کی کٹ جائے
زندگی وہ ثبات ہوتی ہے
اشک بہتے ہیں عشقِ احمدؐ میں
یہ وفا کی زکوٰۃ ہوتی ہے
تیرگی ساری کفر و باطل کی
نورِ احمدؐ سے مات ہوتی ہے
اُنکے دَر سے صبا جب آتی ہے
گُل فشاں کائنات ہوتی ہے
نُور اُن کا معینؔ ہے ہر سو
اُن سے ظاہر وہ ذات ہوتی ہے

صاحبزادہ روح الحسنین معینؔ